عصرِ حاضر کے سماجی مسائل

مغربی ثقافت کے غلبہ اور اسلامی تعلیمات سے
دُوری کی وجہ سے موجودہ حالات میں جو سماجی مسائل پیدا
ہو رہے ہیں اُن پر بصیرت مندانہ تبصرہ اور رہنمائی۔

تالیف
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر
زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی

فہرست مضامین

پیش لفظ

کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے، وہ نسل کی قرابت مندیوں اور رشتہ داریوں کی ڈوری سے بندھا ہوا ہے، ان ہی رشتوں سے خاندان وجود میں آتا ہے، اور کئی خاندان مل کر جب ایک جگہ قیام کرتے ہیں تو اس سے سماج کی تشکیل عمل میں آتی ہے، سماج میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے لوگ بھی، وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو راہ راست پر مستقیم ہیں، اور وہ لوگ بھی جو صحیح راستے سے منحرف ہوگئے، اس لئے سماج میں اچھے اور برے دونوں طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔

ان واقعات کا انسان کی زندگی سے گہرا تعلق ہے، اور انسان چاہے بھی تو اپنے آپ کو مکمل طور پر ان سے الگ نہیں رکھ سکتا، اس لئے آج اصلاح معاشرہ اور سماج سدھار کی آواز ہر طرف سے اٹھ رہی ہے، اور کتنی ہی مقامی، ملکی اور بین الملکی سماجی تنظیمیں ہیں، جو میدان عمل میں اتری ہوئی ہیں، لیکن ایک حقیقت ہے کہ خدا کے یقین، خدا کی بھیجی ہوئی شریعت کی پیروی اور آخرت میں جواب دہی کے احساس کے بغیر سماج کی حقیقی اصلاح نہیں ہوسکتی، اس کے بغیر جو کوششیں کی جاتی ہیں، ان کی مثال درخت کی جڑ کے بجائے اس کے پتوں اور ٹہنیوں پر پانی ڈالنے کے مترادف ہے۔

اسی پس منظر میں راقم الحروف روزنامہ "منصف" کے کالم "شمع فروزاں" میں سماجی مسائل کو خصوصی اہمیت دیتا رہا ہے، بحمد اللہ لوگوں نے نہ صرف اسے پسند کیا، بلکہ بہت سے رسائل و جرائد اسے نقل بھی کرتے رہتے ہیں، اب یہ مستقل مجموعہ کی شکل میں قارئین کی نذر ہے، خدا کرے یہ کم سواد تحریریں سوتے ہوئے دلوں کو جگانے اور غافل اذہان میں فکر کی چنگاری سلگانے میں کچھ کامیابی حاصل کرسکیں۔ وباللہ التوفیق۔

۱۲ شعبان ۱۴۲۵ھ

خالد سیف اللہ رحمانی

۲۹ ستمبر ۲۰۰۴ء

خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

عرضِ مرتب

انسان طبعی طور پر معاشرت پسند واقع ہوا ہے، چنانچہ تمدن کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ لوگ کسی گاؤں یا شہر کو مستقل طور پر آباد نہیں کرتے تھے، بلکہ خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے، اس زمانہ میں بھی لوگ اپنے خاندان اور متعلقین کے ساتھ رہتے تھے، پھر جب رفتہ رفتہ انجمنوں کا قیام عمل میں آیا، دنیا نے تمدن کو اپنایا تو سماج اور سوسائٹی وجود میں آئی، ظاہر ہے یہ سماج حضرت انسان کے وجود سے ہی آج تک قائم ہے، جس کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے خیر و شر دونوں طرح کی خصوصیت رکھی ہیں، کبھی تو وہ رشک فرشتہ بنتا ہے، اور کبھی وہ شیطان سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

انسان کی نیکی و بدی کی یہ صلاحیت انفرادی زندگی کے مقابلہ اجتماعی زندگی میں بہت جلد ترقی کر جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی نیک کام یا برا عمل کوئی شخص تنہا کرے تو سوسائٹی میں اس کا اثر جلد نہیں ہوتا ہے۔ لیکن جب کسی معاشرہ میں بہت سے لوگ ایک ساتھ مل کر کسی خیر یا شر کا کام کریں تو سوسائٹی اس سے بہت جلد متاثر ہوتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے انسانی سماج میں آج کے زمانہ میں خیر اور بھلائی کے مقابلہ شر اور برائی روز افزوں ترقی پر ہے، مغرب کی ایجاد کردہ تہذیب بھی اب مشرقی ممالک کے لئے تہذیب بنتی جا رہی ہے، اور مغرب کی جانب سے چلنے والی ہر ہوا

سے جھوٹے کو مشرق اب بادلِ نخواستہ تصور کرنے لگا ہے، پھر یہ مسائل اپنے نتیجہ کے اعتبار سے صرف مسلمان ہی متاثر ہو رہے ہیں، بلکہ ہر انسان جس کے سینہ میں دل اور دل میں ضمیر ہو، اب یہ پوری انسانیت کا مسئلہ ہو گیا ہے، اور اس سے گھٹن محسوس کر رہا ہے، خود بخود وجود سماج میں برائیاں کیا کم تھیں، مگر مغربی تہذیب نے تو اس کا گراف اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (دامت برکاتہم العالی المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد و جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) کی شخصیت علمی و دعوتی حلقوں میں محتاجِ بیان نہیں، اللہ تعالیٰ نے علمی گہرائی و گیرائی، فکری اعتدال اور زمانہ آگہی، کے ساتھ ساتھ انہیں زبان و قلم اور تعبیر و تشریح کا بے پناہ ملکہ دیا ہے، مشکل سے مشکل تعبیر کو آسان سے آسان تر انداز میں بیان کرنا آپ کا امتیاز ہے، ادھر تقریباً چھ سالوں سے روزنامہ "منصف" حیدرآباد کے جمعہ ایڈیشن میں "شمع فروزاں" کے کالم میں ہر ہفتہ آپ قومی اور بین الاقوامی مسائل پر خصوصی کالم تحریر فرماتے ہیں جو بصد شوق زبان و بیان کی چاشنی اور معنویت کی وجہ سے پڑھے جاتے ہیں، اور عوام و خواص دونوں میں یکساں رہنمائی کی جاتی ہے، اس کالم میں سماجی مسائل سے متعلق بھی بہت سی تحریریں آپ کے قلم سے نکلی ہیں، جو عصرِ حاضر میں پیدا شدہ سماجی مسائل کے اسلامی حل کی رہنمائی کرتی ہیں، راقم نے ان مسائل کو "منصف" کی قدیم فائلوں سے جمع کیا ہے، اور اب یہ مجموعہ "عصرِ حاضر کے سماجی مسائل" کے نام سے آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس مجموعہ میں اکثر اہم سماجی امراض کی طرف نشاندہی کی گئی ہے اور قرآن و سنت کی روشنی میں اس کا علاج

بھی بتایا گیا ہے۔ یقیناً یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر گھر میں پڑھی جائے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو امت مسلمہ بلکہ انسانیت کے لئے نافع بنائے اور قبولیت سے نوازے، اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ مدظلہ کا سایہ تادیر بصحت و عافیت قائم رکھے، اور مؤلف کے ساتھ ساتھ راقم الحروف کو بھی اس کے اجر میں شریک کرے۔

۱۰ شعبان ۱۴۲ھ

محمد نعمت اللہ

۲ ستمبر ۲۰۰ء

([illegible] المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)
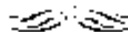
قانونِ شریعت ـــــ رحمت نہ کہ زحمت

ماں باپ اپنے بچوں کی فطرت اور ان کی ضرورت سے سب سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور خیر خواہ بچوں کے اشاروں کو سمجھنے میں بھی انہیں مشکل نہیں ہوتی، یہ تو خیر انسان ہیں، جانور اور حیوانات جو گویائی سے بھی محروم ہیں اور جن کو اشارہ کی بھی زبان نہیں آتی، ان کے مالکان اور پرورش کرنے والے بھی ان کی عادات وضروریات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اس بستی میں بسنے والی تمام مخلوقات اور کائنات کا حاصل "حضرت انسان" کی ضروریات، جذبات، مصالح ومفاسد اور عادات واطوار سے اس سے زیادہ واقف ہوگا، اس لئے خود خالق کائنات انسان کے لئے جتنے بہتر اصول زندگی اور جتنا مناسب قانون حیات وضع کر سکتا ہے، یقیناً کوئی اور مخلوق نہیں کر سکتی، نظام زندگی کو مرتب کرنے کے لئے علم کی ضرورت ہے اور خدا سے بڑھ کر کوئی علیم نہیں، اور اس کے لئے قوت فیصلہ اور دانائی مطلوب ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی حکیم نہیں، اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اسی کو ہے: "الا له الحكم" (انعام: ۶۲)

اللہ تعالیٰ نے جس طرح دنیا میں انسان کے کھانے پینے، لباس و پوشاک اور دوسری ضروریات کا نظم کیا ہے، اسی طرح اس نے انسان کو اپنے نظام زندگی کے بارے میں بھی اندھیرے میں نہیں رکھا، کیوں کہ ایک شخص یا چند اشخاص کا ایک گروہ پوری انسانیت کے جذبات، ضروریات اور فطری تقاضوں سے آگاہ نہیں ہو سکتا اور اس سے اس بات کی بھی امید نہیں کی جا سکتی کہ مختلف انسانی طبقات میں مفادات کا جو ٹکراؤ ہے اور جس سے کہ یہ انسان خود اس کے مفادات بھی متعلق ہیں، وہ ان کے درمیان عدل اور

انسان سے کام نہ لے سکے گا۔ اسی لئے خدا کے رب اور رحمن و رحیم ہونے کا تقاضا تھا کہ وہ انسان کو زندگی گزارنے اور جینے اور مرنے کا طریقہ بھی بتائے۔

اسی طریقہ کی رہنمائی کے لئے ہر دور میں اللہ کے نبی اور رسول آتے رہے۔ حضرت آدم علیہ السلام جہاں پہلے انسان تھے، وہیں انسانوں کے بیچ خدا کے پہلے پیغمبر بھی تھے، یہ سلسلہ آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر مکمل ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لئے جو قانون بھیجا جاتا رہا اسی کو "شریعت" کہتے ہیں۔ انسان کا ابتدائی دور، چونکہ علمی اور تمدنی ناپختگی کا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ اسی زمانے کے احوال کے لحاظ سے احکام دیتے رہے، پیغمبر اسلام ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے جب انسان اپنے تہذیبی، تمدنی اور علمی کمال و پختگی کے مرحلہ میں قدم رکھ چکا تھا، اس لئے آپ کو وہ احکام دیئے گئے جو قیامت تک باقی رہیں گے، جیسے ایک انسان کے جوان ہونے تک جسم میں بڑھوتری جاری رہتی ہے اور سال ڈیڑھ سال پر اس کے کپڑے تنگ ہونے لگتے ہیں، لیکن جب آدمی پوری طرح جوان ہو جاتا ہے تو اب جسم کی افزائش تھم جاتی ہے اور اس وقت وہ جو بھی کپڑے سلوائے آئندہ چھوٹے نہیں پڑتے۔ اسی طرح شریعت محمدی اس وقت دنیا میں آئی جب انسان کی صلاحیت اپنے آخری مرحلہ پر آگئی، اسی لئے یہ شریعت ہمیشہ کے لئے ہے اور کبھی انسان اس میں تنگ دامانی کا احساس نہیں کرے گا، قرآن کی زبان میں اسی کا نام "اکمال دین" اور "اتمام نعمت" ہے۔ (مائدہ ۳)

یہی خدا کا بھیجا ہوا نظام حیات ہے جو "شریعت اسلامی" یا "اسلامی قانون" کہلاتا ہے۔ یہ قانون فلاسفہ یونان کے افکار کی طرح محض "نظریہ" نہیں، جس کا خواب دیکھا جاتا ہے اور اس کی تعبیر بھی دیکھنے میں نہ آئے اور نہ یہ اشتراکی نظام زندگی کی طرح کوئی ایسا قانون ہے کہ ستر سال کی مختصر سی مدت اسے بے نام و نشان کر دے، بلکہ یہ ایک ایسا متوازن، معتدل اور فطرت انسانی سے ہم آہنگ نظام ہے، جس نے کم و بیش ایک ہزار سال ایشیا، افریقہ اور یورپ کے بڑے حصہ پر حکمرانی کی ہے، مختلف تہذیبوں اور سیاسی انقلابوں کا سامنا کیا ہے اور نہایت ہی خوبی کے ساتھ ہر عہد کے مسائل کو حل کیا ہے، دنیا

میں جب بھی اس قانون کی آزمائش کی گئی، اس کی افادیت قانونِ فطرت سے مطابقت اور امن و سلامتی پیدا کرنے کی صلاحیت کا اعتراف کیا گیا ہے، بدقسمتی سے خلافتِ عثمانیہ ترکی کے سقوط کے بعد سے اسلام کی حکمرانی کا دائرہ مساجد اور زیادہ سے زیادہ سماجی زندگی کے کچھ مسائل تک محدود کر دیا گیا، لیکن آج بھی دنیا کے بعض ملکوں: سعودی عرب، افغانستان، سوڈان اور ایران میں اسلامی قانون کے اطلاق کو کسی حد تک وسعت دی گئی ہے، وہاں لوگ اس کی افادیت کا احساس کر رہے ہیں اور امن و سلامتی کی ٹھنڈی چھاؤں اسلام کی برکت سے ان کو حاصل ہے۔

اسی احساس نے گذشتہ چند سالوں میں خاص طور پر ایشیا و افریقہ میں کروٹ لی ہے اور بعض ملکوں میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے رائے عامہ کا اتنا شدید دباؤ ہوا جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا، وہاں بتدریج ان قوانین کو نافذ کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، ایران اور سوڈان اس کی مثالیں ہیں، ان دونوں ملکوں کو تو عرصے سے بنیاد پرستی اور رجعت پسندی کا طعنہ دیا جا رہا تھا، جب طالبان نے افغانستان میں حیرت انگیز فتوحات پائیں اور ایک ایسے ملک کو جو سخت بدامنی اور غارت گری کا شکار تھا، امن سے سرفراز کیا اور وہاں کے باشندوں نے محسوس کیا کہ وہ بہت عرصے کے بعد لاقانونیت اور خانہ جنگی سے امن و امان اور قانون و آئین کی طرف واپس ہوئے ہیں تو پھر ایک نیا پروپیگنڈہ شروع ہوا اور ذرائع ابلاغ میں ان کی تنگ نظری اور کوتاہ فکری کے افسانے تراشے جانے لگے۔

ابھی دو تین ہفتے پہلے اچانک وزیراعظم پاکستان جناب نواز شریف نے شریعت بل کا اعلان کیا جس کے تحت پاکستان میں قرآن و حدیث کو سب سے بالاتر قانون تسلیم کیا جائیگا، یہ اعلان کس قدر اخلاص پر مبنی ہے؟ اس کا علم تو خدا ہی کو ہے! یہ ملک اسلام ہی کے نام پر بنا اور اسلام ہی کا نام لے کر مختلف حکمرانوں نے اقتدار کی سیڑھیاں طے کیں، لیکن حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان میں دو چیزیں ایسی مقدس ہیں جس کو کسی نے کسی وجہ ہندوستان میں دستوری تحفظ حاصل ہے، بظاہر اس قسم کا اعلان محض حکمرانوں کی کرتی ہوئی

سر کو اونچا اٹھانے کی ایک تدبیر ہے، تاہم بعض دفعہ شر سے بھی خیر پیدا ہوتا ہے، اگر اسی بہانے بھی عورتیں بل پاس ہو جائے تو ایک خوش آئند بات ہوگی۔

لیکن اس اعلان نے بھی ایک بار مغرب اور مشرق کو چونکا دیا اور بعض لوگ اسی طرح اس کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ گویا کوئی خوفناک زلزلہ یا طوفان آنے والا ہے، حد یہ ہے کہ ہمارے ملک کی بی۔ جے۔ پی، ورلڈ ہندو پریشد جو خود رام راج کا نعرہ لگاتی ہے اور ہندو راشٹر کا خواب دیکھتی ہے، وہ بھی اسے مذہبی بنیاد پرستی کا نام دے رہی ہے، اس طرح کے بیانات سے عام لوگوں میں غلط فہمی کی فضاء قائم ہوتی ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ واقعی یہ کوئی ”زیادتی“ کی چیز ہے، حالانکہ اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو یہ ایک اچھی تدبیر ہے جو کہ عورتوں اور انسانیت کے مفاد میں ہے، نہ کہ ان کے لئے نقصان اور پریشانی کا باعث۔

اسلامی شریعت کا اصل امتیاز دو باتیں ہیں: عدل اور اعتدال، عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر آدمی کی ذمہ داری اس کی صلاحیت کے لحاظ سے متعین کی جائے، جیسے ملک کا دفاع، امن وامان کا قیام اور اسی طرح کی ذمہ داریاں مردوں سے متعلق ہوں گی، کیوں کہ وہی اس کی صلاحیت رکھتے ہیں، امور خانہ داری کی انجام دہی اور بچوں کی پرورش عورتوں کے ذمہ ہے گی، کیوں کہ وہ ان کاموں کو زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں، اعتدال سے مراد یہ ہے کہ حقوق وفرائض کی تعیین میں افراط وتفریط نہ ہو جائے، جیسے یہی خواتین کے حقوق کا مسئلہ ہے، بعض قوموں نے عورتوں کو اس درجہ گرایا کہ ان کو انسانیت کی آخری صف میں بھی جگہ نہیں دی، اور بعض نے اتنا اونچا اٹھایا کہ جن ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت ان میں نہیں تھی، وہ ذمہ داریاں بھی ان سے متعلق کر دی، یہی حال مزدوروں کے معاملہ میں ہوا، کچھ لوگوں نے مزدوروں کو سرمایہ داروں کا زر خرید غلام بنادیا اور کچھ لوگوں نے کہا کہ حکمرانی مزدوروں ہی کا حق ہے، اس افراط وتفریط نے ہمیشہ سماج کو نقصان پہنچایا ہے، شریعت اسلامی کا یہی امتیاز ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں اس کے قوانین تقاضۂ عدل کو پورا کرتے ہیں اور افراط وتفریط اور بے اعتدالی سے پاک ہیں، خود [illegible]

قصاص کے قوانین جو جرائم اور سزاؤں سے متعلق ہیں، کو بنظر انصاف دیکھا جائے تو نہایت متوازن اور قانونِ فطرت سے ہم آہنگ ہے۔

عام طور پر ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی قانون قریب ڈیڑھ ہزار سال پرانا ہے، اس درمیان دُنیا کتنی ہی معاشی، سماجی اور سیاسی تغیرات سے گذر چکی ہے، جو انسان بیل گاڑیوں پر سفر کرتا تھا، اب ہوا کے دوش پر اُڑتا ہے اور سمندر کی تہوں میں غواصی کرتا ہے، ایسے فرسودہ عہد کے قوانین اس ترقی یافتہ اور متمدن عہد کے لئے کیوں کر کفایت کر سکتے ہیں؟ لیکن یہ خیال محض غلط فہمی پر مبنی ہے، دراصل انسان سے دو چیزیں متعلق ہیں ایک اس کی فطرت، دوسرے وہ وسائل و ذرائع جو اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں، غور کیا جائے تو جو کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں، ان سب کا تعلق اسباب و وسائل کی دُنیا سے ہے، انسان کی فطرت اور اس کے اندرون میں کوئی تبدیلی نہیں، ہاں ان کے طریقے ضرور بدل گئے ہیں، کھانے پینے کا ڈھنگ ضرور بدلا ہے، لیکن بھوک و پیاس جیسے پہلے ہوتی تھی ویسے اب بھی ہے، انسان نے تلوار اور تیر کی جگہ ایٹم بم اور میزائل بنا لیا ہے، لیکن اس کے پس پردہ جو جذبۂ انتقام وعداوت پہلے کار فرما تھا، اب بھی وہی عامل زندگی کے تمام شعبوں میں ہے۔

اسلامی قانون کا اصل موضوع انسانی فطرت ہے، نہ کہ اسباب و وسائل، وہ انسان کی فطری خواہشات اور جذبات کو کنٹرول کرتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ طاقت کا استعمال ظلم کو دور کرنے کے لئے کرو، نہ کہ خود ظلم کرنے کے لئے، وہ کہتا ہے کہ دولت غریبوں کے گھر چراغ روشن کرنے پر صرف کرو، نہ کہ اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے، وہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی ذہنی اور فکری قوت انسان کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کرے، نہ کہ انسان کے لئے ہلاکت خیز وسائل کی ایجاد میں، وہ چاہتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کا استعمال سچی حقیقتوں کے اظہار اور سچائی کی مدد کے لئے ہو، نہ کہ جھوٹے پروپیگنڈے اور سچائی کو دبانے کے لئے، اس لئے جوں جوں وسائل و اسباب کی دُنیا میں ترقی ہوتی جائے گی، اسلامی قانون کی اہمیت اور ضرورت بھی اسی نسبت سے بڑھتی جائے گی، یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کا کوئی ایسا قانون نہیں جس نے اسلام سے خوشہ چینی نہ کی ہو، خاص کر سماجی

قانون میں تو اسلامی قانون سے اتنا ذخیرہ اخذ کیا ہے کہ اس کا شمار مشکل ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں جہاں اور جس قدر اسلامی شریعت سے اعراض اور گریز کا راستہ اختیار کیا گیا، وہاں اسی قدر وہ مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔

اس لئے اسلامی شریعت کا نفاذ ایک رحمت ہے نہ کہ زحمت، اس سے نہ کسی کو خطرہ ہے اور نہ اس پر دنیا کو اندیشہ میں مبتلا ہونے کی ضرورت، حقیقت یہ ہے کہ یہ سراسر رحمت اور امن و سلامتی ہے، مسلمانوں کے لئے بھی، مسلم ممالک کی غیر مسلم اقلیتوں کے لئے بھی اور ان کے پڑوسیوں کے لئے بھی، خدا کرے کہ مسلم ممالک اس بات کے لئے تیار ہوں کہ وہ اپنی زمین پر صرف خدا کی رضا کے لئے قانون شریعت کو اس کی تمام وسعتوں کے ساتھ مصلحت اور حکمت کی رعایت کرتے ہوئے نافذ کریں، اگر واقعی انہوں نے ایسا کیا تو یہ ایک ایسا تجربہ ہوگا، جس سے دنیا سبق سیکھے گی اور بہت سی زبانیں جو محض عناد اور حسد سے کھلی ہیں گنگ ہو جائیں گی!

(۲۰/ مئی ۱۹۹۸ء)

اہانتِ رسولؐ ـــــ ایک سنگین جرم

دنیا کی معلوماتی تاریخ میں ہمیشہ ہی انسان کی غالب اکثریت مذہب پر یقین رکھتی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے بتایا ہے کہ اسلام اور خدا کے سامنے خود سپردگی انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے: "فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا" (الروم: ۳۰) یہ اور بات ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب ہدایت سے محرومی کی بناء پر جذبۂ بندگی کا غلط استعمال کرے اور اس کا سر خالق کے بجائے مخلوق کے سامنے خم ہونے لگے؛ لیکن بہرحال مذہب سے وابستگی انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مذہب اور اپنے مذہبی پیشوا سے وابستگی کا مسئلہ انسان کے لئے شاید سب سے زیادہ جذباتی اور حساس مسئلہ ہوتا ہے، جاں نثاری، وفاشعاری اور قربانی کی جو مثالیں مذہب کی نسبت سے ملیں گی، شاید ہی کہیں اور مل پائیں، اس راہ میں کتنے ہی لوگوں نے آگ پر چلنا، شعلوں میں جلنا، سمندر میں غرقاب ہونا اور زندہ دفن کیا جانا تو قبول کیا ہے، لیکن اپنے فکر و عقیدہ سے انحراف کسی طور پر گوارا نہیں کیا، اس لئے ہر عہد میں عدل وانصاف کی راہ چلنے والوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب پر چلتے ہوئے دوسرے مذاہب کے متبعین کے جذبات کا پاس رکھنا ضروری ہے اور یہ تو درست ہے کہ آدمی کسی فکر اور عقیدہ پر سنجیدہ علمی تنقید کرے لیکن کسی مذہب اور مذہبی پیشوا کے ساتھ تنقیص و تمسخر اور سب و شتم کرنا کوئی بھی کسی مذہب و قانون روا نہیں رکھ سکتا۔

اسلام دین فطرت ہے، جس نے انسانی جذبات کی تکریم کا قدم قدم پر پاس رکھا ہے، وہ اس پہلو سے بھی ایک مکمل اور فطرت انسانی سے ہم آہنگ دین ہے، گزشتہ انبیاء کی نسبت قرآن مجید کو "مصدق" قرار دیا گیا، (البقرۃ: ۸۹) یعنی یہ کتاب گزرے ہوئے پیغمبروں کی

تصدیق کرتی ہے، ورنہ دنیا کی بدنصیب قوموں نے ان برگزیدہ ہستیوں کی پاک دامنی کو ان پر
تہمت اور بدگمانیوں کا جو نشانہ بنا رکھا تھا، یہ کتاب انہیں صاف کرتی ہے۔ بائبل حضرت نوحؑ کے
بارے میں کہتی ہے کہ شراب پی کر برہنہ ہوگئے، (تکوین ۲۱،۲۰) حضرت لوطؑ کے بارے میں
ان کا بیان ہے کہ (نعوذ باللہ) انہوں نے خود اپنی بیٹی کے ساتھ زنا کی، (پیدائش ۲۰۔۳۰)
حضرت یعقوبؑ کے صاحبزادے یہوداہ کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ انہوں نے اپنی بہو
سے بدکاری کی، (پیدائش ۳۸۔۱۸) حضرت داؤدؑ کو اپنے سپاہی کی منکوحہ سے ملوث قرار
دیتی ہے، (۲۔سموئیل ۱۱:۴) حضرت سلیمان کے بارے میں کہتی ہے کہ وہ مرتد اور بت پرست
ہوگئے تھے، حضرت یوسفؑ کو بدقماش ٹھہراتی ہے، حضرت مسیحؑ کو الٰہی قرار دیتی ہے، قرآن اور
حامل قرآن نے حضرات انبیاء کی پاکیزہ زندگیوں پر پڑی ہوئی بدگمانی اور تہمت اندازی کی
ان دبیز چادروں کو چاک کیا اور ان کو برگزیدہ، خدا کے یہاں مقبول اور انسانوں کے لئے اسوہ
نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا اور ان کو برگزیدہ، خدا کے یہاں مقبول اور انسانوں کے لئے اسوہ
نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا، اسی لئے ہر مسلمان پر اپنے پیغمبر کی طرح ہر پیغمبر پر ایمان لانا اور
ان کے احترام کو برقرار رکھنا واجب ہے، ایک مسلمان محمد ﷺ پر کتنا ہی یقین رکھتا ہو اور
شریعت اسلامی پر عمل کرنے میں کتنا ہی پابند نظر آتا ہو، مگر اس نے ایک بھی رسول کا انکار کیا یا
ان کی ہتک شان کی تو وہ مسلمان باقی نہیں رہ سکتا۔

پھر قرآن مجید نے ایک اصولی بات کی ہے جو ہر مسلمان کو اس بات پر مجبور کرتی ہے
کہ وہ اسلام سے پہلے کے تمام مذہبی پیشواؤں کا احترام کریں اور ان کے بارے میں محتاط لب و
لہجہ اختیار کریں، قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بے شمار انبیاء بھیجے ہیں، ہر قوم میں اپنے پیغمبر
مبعوث کیا ہے (فاطر: ۲۴) اور ہر زبان میں اپنا صحیفہ ہدایت نازل فرمایا، (ابراہیم: ۴) یہ
عقیدہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ مختلف اقوام جن مذہبی پیشواؤں پر ایمان رکھتی ہیں، عجب
نہیں کہ وہ اپنے زمانہ میں اللہ کے رسول رہے ہوں اور ان کی تعلیمات میں انسانی تحریف اور
حالات نے ان کو توحید سے دور کردیا ہو، اسی لئے کرشن جی، بودھ، مہاتما یا کنفیوشس،
مسلمان ان کے بارے میں بدگوئی نہیں کرسکتے، حضرت مسیحؑ اور پیغمبر اسلام ﷺ کے درمیان

صرف پانچ سو ستر سال کا فاصلہ ہے، اس کے باوجود بائبل (عہد جدید) میں کیا کچھ تحریف نہیں ہوئی، خود عیسائی علماء و محققین کو اس کا اعتراف ہے، تو ان بزرگوں کا عہد تو اسلام سے بہت پیچھے کا ہے، ان کی تعلیمات میں انحراف و تبدیلی کا پایا جانا بالکل عجیب نہیں!

یہ تو ان برگزیدہ ہستیوں کا ذکر ہے جو مقام نبوت پر فائز ہیں، یا جن کے بارے میں اس کا احتمال موجود ہے کہ وہ اپنے عہد کے پیغمبر رہے ہوں، قرآن نے تو معبودان باطل کو بھی برا بھلا کہنے سے منع فرمایا، کہ اس سے انسانی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور رد عمل کی نفسیات جاگ اٹھتی ہے۔ (الانعام: ۱۰۸) قرآن کا مطالعہ کیجئے اور احادیث پر نظر ڈالئے! عقیدۂ توحید کا اثبات اور شرک کی تردید قرآن و حدیث کی تمام تعلیمات کا لب و لباب اور روح کا خلاصہ ہے، لیکن بنیاد و اصل کے احترام میں کہیں کوئی کمی نہیں اور نہ تلقین کی نہ کہیں دل آزاری ہے اور نہ جذبات کو ٹھیس پہنچانے والی زبان اور بیان۔

اسلام جو رویہ دوسرے مذہب کی بابت اختیار کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھا جائے، نظریاتی تنقید نے کبھی مسلمان علماء و عوام کو مشتعل نہیں کیا، مسلمانوں نے بلند حوصلگی اور علمی بلند نگاہی کے ساتھ ان کا سامنا کیا، اسلامی تعلیمات کی جو "علم کلام" کے نام سے علوم اسلامی کا ایک اہم شعبہ مانا جاتا ہے، کا موضوع ہی یہی ہے کہ اعتقادات کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو مدلل طور پر پیش کیا جائے اور اسلامی معتقدات پر کئے جانے والے شبہات کا جواب دیا جائے، خود ہندوستان میں اسلام کے خلاف ایسی کتابیں لکھی گئیں جن کی سرخی دل آزاری اور دریدہ دہنی سے عبارت تھی، جیسے پنڈت دیانند سرسوتی جی کی "ستیارتھ پرکاش"، لیکن مسلمانوں نے ایسی تحریروں پر بھی صبر کا دامن نہ چھوڑا اور اس کا دندان شکن اور مسکت علمی جواب دیا۔

لیکن ظاہر ہے کہ کوئی بھی مذہب اور اس مذہب کے متبعین کے لئے یہ بات گوارا نہیں ہو سکتی کہ اس کے بارے میں سب و شتم اور یاوہ گوئی کا طریقہ اختیار کیا جائے، بلکہ کوئی بھی معقول قانون ایسے طرز عمل کو برداشت نہیں کر سکتا، جس سے لاکھوں انسانوں کے جذبات مجروح اور احساسات زخمی ہوں، آج فضائیات کی اسکالنگ کی منزل ہے، کسی ملک کے جھنڈے

کی توہین کی جائے تو یہ سخت قابل مواخذہ ہے، تو کیا مذہبی پیشواؤں کی توہین اس درجہ کا جرم نہیں؟ اسی لئے اسلام میں رسولوں اور پیغمبروں کی شان میں گستاخی کرنے والوں کی سزا قتل ہے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے بھی اس سنگین جرم کی یہی سزا منقول ہے۔ (فتح القدیر: ۹۲/۶) حقیقت یہ ہے کہ اگر اس سے بڑی بھی کوئی سزا ہو سکتی اور ایک مجرم کو ایک سے زیادہ دفعہ قتل کیا جانا ممکن ہوتا تو ایسا شخص اس کا بھی سزاوار تھا، کیونکہ ایک انسان کے قتل کی سزا قتل ہے، حالانکہ اس سے ایک خاندان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، ایک ملک سے بغاوت کی سزا قتل ہے، حالانکہ اس سے بھی ایک محدود گروہ کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے، تو ایک ایسی شخصیت کی بے احترامی جس سے کروڑوں انسانوں کے احساسات مجروح ہوتے ہوں، اس کا جرم یقیناً اس سے بڑی سرزنش کا مستحق ہے۔

فقہاء کے یہاں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں، فقہ کے چاروں دبستان حنفیہ، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ اس بات پر متفق ہیں (دیکھئے: رد المحتار: ۲۹۰/۳، المغنی ۳۳/۹) اور علامہ ابن تیمیہؒ نے تو اس موضوع پر مستقل کتاب "سیف اللہ المسلول علی شاتم الرسول" کے نام سے لکھی ہے، بلکہ بعض حنفی فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ رسول کے ساتھ گستاخی کرنے والے شخص کی دنیا کے احکام کے اعتبار سے توبہ بھی قبول نہیں کی جائے گی، چاہے آخرت میں اس کی توبہ قبول ہو جائے، علامہ عبدالرشید طاہر بخاری متاخر فقہاء میں ہیں، لکھتے ہیں:

> "جس نے رسول اللہ ﷺ کو برا کہا، آپ ﷺ کی اہانت کی، آپ ﷺ کے دین، آپ ﷺ کی شخصیت یا آپ ﷺ کے اوصاف کی نسبت سے بدگمانی کی تو چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، یہودی، عیسائی ہو یا مشرک، مسلم ملک کا مسلم باشندہ ہو یا دار الحرب کا، اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔"
>
> (خلاصۃ الفتاویٰ: ۳۸۶/۴)

شاید یہ اس لئے کہ اگر اس معاملہ میں ایسی نرمی کو روا رکھا جائے تو اندیشہ ہے کہ بدقماش اور بد دین قسم کے لوگوں کو موقع مل جائے کہ وہ بدگوئی کریں اور پھر سزا سے بچنے کے لئے اپنے تائب ہونے کا اظہار کریں اور اس طرح حضرات انبیاء کرام جو انسانیت کے لئے

جو اپنا راہ اور مختصر طریق ہے کہ حیثیت طیب بازیچۂ اطفال بن کر رہ جاتی ہیں۔

اس وقت ذرائع ابلاغ میں پاکستانی عدالت کا وہ فیصلہ موضوع بحث بنا ہوا ہے، جس میں "ایوب مسیح" نامی ایک عیسائی کو پیغمبر اسلام ﷺ کی اہانت کے جرم میں پھانسی کی سزا تجویز کی گئی، اس پر ۶۷ سالہ کیتھولک بشپ جان جوزف نے عدالت میں احتجاجاً خودکشی کرلی اور وصیت کی کہ جب تک یہ قانون منسوخ نہ ہو، اس کی لاش اٹھائی نہ جائے، مغربی ممالک کو چاہئے تھا کہ وہ ایوب مسیح کی اس ناشائستہ حرکت کی مذمت کرتے اور عیسائیوں کو تلقین کرتے کہ وہ دوسروں کے جذبات کا پاس و لحاظ کریں اور بشپ کی اس غیر اخلاقی اور غیر قانونی خودکشی کو ظلم اور ایک غیر قانونی کام میں تعاون تصور کرتے مگر اس کے بجائے وہ ان مجرموں سے ہمدردی کا رویہ اختیار کررہے ہیں اور پاکستان کو تلقین کررہے ہیں کہ اس مذکورہ قانون کو منسوخ کرے۔

یہ بھی ایک طرفہ تماشہ ہے کہ امریکہ و برطانیہ میں بائبل اور حضرت مسیح کی اہانت قابل سرزنش جرم ہو تو یہ غیر منصفانہ نہیں، مصر و الجزائر میں مغرب نواز حکومتیں کسی معقول سبب کے بغیر سیکڑوں علماء کو آئے دن پھانسی دیتی رہیں، تو مغرب کے کانوں پر جوں تک نہ رینگے، بوسنیا میں انسانوں کو اس بے دردی سے ذبح کیا جائے کہ لوگ سانپ اور موذی جانوروں کے ساتھ بھی شاید ایسا رویہ نہیں برتتے ہوں، تو اس "عیسائی دہشت گردی" پر زبانی جمع خرچ سے آگے کوئی قدم نہ اٹھایا جائے، اسرائیل میں جبراً مسلمانوں سے ان کا مکان خالی کرالیا جائے اور عین مسجد میں مسلمانوں کا قتل عام ہو جائے تو مغربی اقوام کو خواب خرگوش سے فرصت نہ ہو، لیکن کروڑوں انسانوں کے جذبات کو مجروح کرنے والے ایک مجرم کے لئے انسانیت اور تہذیب کے یہ نام نہاد علمبردار ایک زبان ہو کر کھڑے ہو جائیں، افسوس کہ مغرب نے اپنے جسم سے حیا کا لباس تو اتار ہی پھینکا تھا، انصاف و غیر جانبداری کا جو مصنوعی غازہ اپنے چہرہ پر مل رکھا ہے، یہ بھی معمولی واقعات ہی سے اتر جاتا ہے اور اصل مکروہ چہرہ دیکھنے میں ذرا مشکل پیش نہیں آتی!

(۲۴/مئی ۱۹۹۸ء)

اوہام پرستی اور اسلام

اسلام کا بنیادی عقیدہ " توحید " یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے بھی یکتا ہے، خدا کا کوئی کنبہ اور خاندان نہیں اور نہ اس کے لئے اولاد اور اعزہ و اقارب ہیں اور خدا اپنی صفات اور اختیارات کے اعتبار سے بھی یکتا اور بے مثال ہے، حیات و موت کی کلید اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، وہی رزق دیتا ہے، رزق میں وسعت اور تنگی پیدا کرتا ہے اور رزق سے محروم کرتا ہے، وہی نفع پہنچاتا ہے اور وہی نقصان سے دوچار کرتا ہے، کامیابی و ناکامی اور فتح و شکست اسی کے حکم سے وابستہ ہے۔ توحید کا یہ تصور در در سر جھکانے سے انسان کو بچاتا ہے اور بہت سی غلامیوں سے نجات عطا کرتا ہے، انہی میں ایک توہمات کی غلامی ہے۔

اوہام پرستی بھی ایک طرح کی غلامی ہے، کہ آدمی اپنے پاؤں کی ٹھوکروں میں رہنے والی چیزوں سے بھی ڈرنے اور خوف کھانے لگے اور اس سے اپنے نفع و نقصان کو وابستہ کر لے، اگر سامنے سے کوئی جانور نکل جائے تو آدمی سمجھے کہ یہ سفر ناکام ہوگا، گھر پر کوئی پرندہ بیٹھ جائے تو اس کو اپنے لئے مصیبتوں کا پیش خیمہ سمجھنے لگے، کسی خاص پتھر کی انگوٹھی سے کامیابی اور نفع کی امید رکھے، کسی مہینہ، دن اور گھڑی کو نامبارک، منحوس اور "اشبھ" تصور کرنے لگے: یہ سب توہمات کی غلامی ہے، جو شخص عقیدۂ توحید سے محروم ہو اور خدا پر اس کا یقین کامل نہ ہو، مشکل ہے کہ وہ اس غلامی سے آزاد ہو سکے، یہی وجہ ہے ایسے ترقی یافتہ ممالک جہاں صد فیصد تعلیم یافتہ لوگ پائے جاتے ہیں، وہاں بھی لوگ بعض اعداد کو منحوس سمجھتے ہیں، ہوٹلوں میں اس نمبر کے روم نہیں رکھے جاتے۔

جو شخص توحید پر جتنا پختہ یقین رکھتا ہو اور اللہ پر جس کا جتنا زیادہ ایمان ہو، وہ اسی قدر اوہام پرستی کی اس مصیبت سے آزاد اور توہمات کا اسیر بننے سے محفوظ رہے گا۔ اسلام کی آمد سے پہلے عربوں میں اس طرح کے توہمات پائے جاتے تھے، لوگ سفر کے لئے نکلتے، پرندے کو اڑایا جاتا، اگر وہ دائیں جانب اڑ جاتا تو اسے نیک فال تصور کرتے اور سفر کرتے اور اگر بائیں طرف سے اڑتا تو بدفالی لیتے اور سفر سے گریز کرتے۔ اسی طرح الو کو منحوس پرندہ خیال کرتے، کسی کے گھر پر بیٹھ جاتا تو سمجھتے کہ یہ گھر اجڑ جائے گا۔ صفر کے مہینہ کو نامبارک سمجھتے، سمجھتے کہ اس ماہ میں جو کاروبار ہوگا نقصان سے دوچار ہوگا، جو سفر ہوگا وہ نامراد ہوگا، جو شادی ہوگی وہ ناکام ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان تصورات کی تردید فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ (بخاری، باب الجذام)

دوسرے کو بیماری لگنے، پرندہ سے بدفالی، الو اور ماہ صفر کو منحوس سمجھنے کی کوئی حقیقت نہیں۔

عربوں میں اور ایک خیال یہ تھا کہ صحراء میں کچھ شیاطین ہوتے ہیں، جو رنگ بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور راہ گیروں کو راستے سے بھٹکانے کا کام کرتے ہیں، عرب ان کو "غول" کہا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس تصور کی بھی نفی فرمائی (فتح الباری ۱۰/۱۶۸)

عرب شوال کے مہینہ کو بھی نامبارک اور شادی بیاہ کے لئے ناموزوں تصور کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے شوال میں نکاح فرمایا اور شوال ہی میں رخصتی بھی ہوئی، چنانچہ حضرت عائشہؓ اس خام خیالی کی تردید کرتے ہوئے فرماتی تھیں کہ میرے نکاح سے زیادہ بابرکت نکاح کون سا ہو سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ پر جس قدر قوی ایمان ہوگا، اوہام پرستی سے انسان اسی قدر دور رہے گا۔ اسلام نے توحید کے عقیدہ کو لوگوں کے ذہن میں ایسا راسخ کر دیا تھا کہ وہ اس قسم کے تصور کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتے تھے، حضرت زنیرہؓ ایک صحابیہ ہیں، ایمان لائیں، لوگوں نے اتنا ظلم کیا کہ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، لوگ کہنے لگے کہ دیویوں، دیوتاؤں کو برا بھلا کہنے اور ان کا انکار کرنے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہوگئی ہے، ہمارے

زمانے میں عورتیں تو کیا مرد بھی اور جاہل و ان پڑھ تو کیا پڑھے لکھے بھی ایسے موقعوں پر گرفتار اوہام ہو جاتے ہیں، لیکن حضرت زنیرہؓ کے قدم میں ذرا بھی تزلزل نہیں آیا کیونکہ ان کی صرف بصارت اللہ نے لی تھی، وہ ایمان اور ایمانی بصیرت سے محروم نہیں ہوئی تھیں، حضرت زنیرہؓ کہتی تھیں کہ یہ سب اللہ کے فیصلے وہ اسی کے حکم سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ ان کی استقامت اور ثابت قدمی سے بہت خوش ہوئے اور ان کے لئے دعا فرمائی، چنانچہ پھر ان کی بصارت لوٹ آئی۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب مصر کا علاقہ فتح ہوا، مصر کی معیشت کا مدار دریائے نیل پر تھا، یہاں معمول تھا کہ یہ دریا جب خشک ہو جاتا تو ایک کنواری لڑکی کو دلہن بنا کر دریا کے بیچ میں ڈال دیا جاتا، دریا کی پُر تیز موجیں اٹھتیں، دریا سے موت کی نیند سلانے کے بعد جاری ہو جاتی تھیں، جب مصر کے خلافتِ اسلامیہ کے زیرِ نگیں آنے کے بعد دریا خشک ہوا اور گورنرِ مصر حضرت عمرو ابن عاص رضی اللہ عنہ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے رواج توڑ دیا، پھر لوگوں کے اصرار پر مشورہ کے لئے خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ کو خط لکھا، حضرت عمرؓ نے اپنے جواب کے ساتھ ایک اور تحریر دریائے نیل کے نام لکھا اور ہدایت دی کہ اس تحریر کو دریائے نیل میں ڈال دیا جائے، حضرت عمرؓ نے اپنی اس تحریر میں دریا کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر تو اللہ کے حکم سے جاری ہے تو میں دعا کرتا ہوں کہ تو جاری ہو جائے اور اگر اللہ کے حکم سے جاری نہیں ہے تو ہمیں تیری ضرورت نہیں، حسبِ ہدایت یہ تحریر دریا میں ڈال دی گئی اور دریائے نیل اس شان سے جاری ہوا کہ دوسرے دن (جو جمعہ کا دن تھا) سولہ ہاتھ پانی ہو گیا (البدایہ والنہایہ: ۷/۱۰۰) اور پھر آج تک کبھی نہیں تھما۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ہندوستان کے ساحلی علاقہ میں پیش آیا، جس کا تذکرہ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے کہ یہاں کے لوگ کافر تھے، یہاں ہر ماہ شیطان وارد ہوتا، اس کے لئے سمندر کے کنارے ایک بت خانہ بنا ہوا تھا، جو "بدخانہ" کہلاتا تھا، جو دن شیطان کی آمد کا ہوتا لوگ اس دن ایک کنواری لڑکی کو سنوار کر اس بدخانہ میں بٹھا دیتے،

رات میں وہیں چھوڑ دیتے، جب صبح کو آتے تو اسے اس حال میں پاتے کہ وہ مردہ ہوتی اور کنواری نہ ہوتی۔ اتفاق سے یہاں ایک مغربی ابوالبرکات بربری جو حافظ قرآن تھے، آئے ہوئے تھے، وہ ایک بوڑھی خاتون کے مہمان تھے، ایک دن جب اپنے میزبان کے یہاں پہنچے تو دیکھا کہ خلاف معمول وہ بوڑھی خاتون بہت سی عورتوں کے ساتھ مصروف گریہ و بکا ہے، ایک ترجمان کے واسطے سے صورت حال دریافت کی تو معلوم ہوا کہ شیطان سے بچاؤ کے لیے آج اس کی اکلوتی بچی کے نام قرعۂ فال نکلا ہے۔

شیخ ابوالبرکات کو دلی ترس آیا، انھوں نے پیشکش کی کہ آج اس لڑکی کی جگہ وہ جائیں گے، چنانچہ وہ بدخانہ میں بیٹھ گئے اور قرآن کی تلاوت کا سلسلہ جاری رکھا، اسی طرح پوری رات گذر گئی، جب معمول کے مطابق لوگ صبح میں تحقیق حال کے لئے پہنچے تو دیکھا کہ وہ زندہ و سلامت ہیں اور تلاوت میں مصروف ہیں، یہ خبر شدہ شدہ پورے علاقہ میں پھیل گئی اور علاقے کے راجہ تک اطلاع پہنچی، ابن بطوطہ نے اس کا نام "وشنوارزہ" لکھا ہے، جب کہ "وشنوراجہ" کی بدلی ہوئی صورت ہو، شیخ نے راجہ پر بھی اسلام پیش کیا، اس نے کہا کہ آئندہ ماہ تک میرے پاس رہو، اگر آئندہ مہینہ میں بھی تم یہی عمل کر کے دکھاؤ اور ہم لوگوں کو اس شیطان کی اذیت سے بچا سکو تب ہم ایمان لے آئیں گے، اگلے ماہ بھی یہی واقعہ پیش آیا، چنانچہ راجہ مسلمان ہو گیا اور راجہ کے ساتھ رعایا کے اکثر لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔ (رحلہ ابن بطوطہ ارد ۵۹۹۔۶۰۰)

اگر ایمان قوی ہو اور اللہ سے نفع و نقصان کا سچا یقین ہو تو ایک جاہل اور ان پڑھ شخص بھی ایسے اوہام و خرافات میں مبتلا نہیں ہو سکتا، تیمور لنگ کوئی عالم و فاضل حکمراں نہیں تھا، لیکن جب اس نے دریائے جمنا کو عبور کرنا چاہا تو نجومیوں نے منع کیا اور کہا کہ یہ نحوس گھڑی ہے، تیمور نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی اور کہا کہ ہم ارباب توحید ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے، یہ تو مشرکین اور تثلیث پر ایمان رکھنے والوں کا عقیدہ ہے اور اگر ایمان میں ناپختگی اور یقین میں کمزوری ہو تو اچھے خاصے پڑھے لوگ بھی ایسی چیزوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔

اس ملک میں رہتے ہوئے جہاں ہم نے برادرانِ وطن سے زندگی کے دوسرے شعبوں اور سماجی رسوم و رواجات میں چند دوسری چیزوں کا اثر قبول کیا، وہیں فکر و عقیدے کے باب میں بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ ان ہی میں سے ایک "توہم پرستی" کا مزاج و مذاق ہے، آج مسلمان بھی سمجھتے ہیں کہ بلی راستہ کاٹ دے تو سفر ملتوی کر دینا چاہئے، الو کا بیٹھنا نحوست کی علامت ہے، اگر کسی بہو کے گھر میں آنے کے بعد سسرال میں کسی کا انتقال ہو جائے تو اس کو منحوس تصور کیا جاتا ہے، گھر کی تعمیر شروع ہوتی ہے تو پرانے جوتے جوڑے جاتے ہیں، گاڑی خریدی جائے تو چند لیموں لٹکائے جاتے ہیں اور اب ایک نئی بات تعمیر کی تعمیر میں "واستو" کی شروع ہوئی ہے، چنانچہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر کو کس زاویہ پر بنا ہونا چاہئے، خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی خلاف ورزی میں بے برکتی ہوگی اور نقصان اٹھانا پڑے گا، حالانکہ شرعاً ایک مسلمان کے لئے صرف یہ رعایت ضروری ہے کہ بیت الخلاء کی نشست ایسی ہو کہ قضاءِ حاجت کرتے ہوئے چہرہ یا پشت قبلہ کی سمت میں نہ پڑے اور نئی مکان کے مسئلہ میں اس کے علاوہ وا انجینئر سے مشورہ کرنا چاہئے کہ مکان کس طرح کا ہو کہ ہوا اور روشنی پوری طرح پہنچے، لیکن اس کا مشورہ بھی پنڈتوں سے کیا جاتا ہے، جو محض چند پیسوں کے لئے لوگوں کو اوہام میں گرفتار رکھنا چاہتا ہے، یہ تمام باتیں محض ایمان کی کمزوری اور ضعفِ عقیدہ کا نتیجہ ہیں، حد یہ ہے کہ اب بعض مسلمان بھی عقدِ نکاح کے وقت اور شادی کے جوڑوں کے سلسلہ میں عاملین سے مشورہ لیتے ہیں، گویا جس غلامی سے اسلام نے انسان کو آزاد کیا تھا، خود ہی ہم آپ اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر بدبختی اور کیا ہوگی کہ آپ ﷺ نے کھلے لفظوں میں "صفر" کے منحوس ہونے کی تردید فرمائی، یہ تردید نہایت ہی صحیح اور معتبر روایتوں سے ثابت ہے، اس کے باوجود "صفر" کی ۱۳ تاریخ اور آخری چہار شنبہ کو منحوس دن تصور کیا جاتا ہے، چنانچہ لوگ چھلے فروخت کرنے اور اپنے روزگار کا مسئلہ حل کرنے کی غرض سے باور کراتے ہیں کہ اس دن ارضی و سماوی بلائیں نازل ہوتی ہیں اور وہ ان کا ازالہ کر سکتے ہیں، حالانکہ اسلام کی نگاہ

وندے ماترم

اپنے وطن سے محبت ایک فطری چیز ہے، انسان جس فضا میں بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے، وہاں کے ایک ایک ذرہ سے انس اور پیار ہوتا ہے، صحابہؓ نے جب مکہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ پہنچے تو اہل مدینہ نے دل و نگاہ فرشِ راہ کر دیئے، لیکن اس کے باوجود مہاجرین کی بے قراری کم نہ ہوتی تھی، وہ مکہ کے پہاڑوں، ریگزاروں اور گھاس کو یاد کر کر کے تڑپتے تھے، حضور ﷺ ان کو تسلی دیتے تھے اور دعا بھی فرماتے تھے کہ مدینہ کی سرزمین ان کو محبوب ہو جائے، خود آپ ﷺ نے جب مکہ سے رختِ سفر باندھا تو شہر سے باہر نکل کر مکہ کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت درد سے فرمایا کہ مجھے تمہارا فراق گوارا نہیں تھا، لیکن اہل مکہ کی بدسلوکی نے مجھے اس پر مجبور کیا ہے، پھر جب مدینہ کو آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے اپنا وطن بنایا تو مدینہ ایسا محبوب ہوا کہ آپ ﷺ کو اس کے خشک پہاڑ سے بھی پیار تھا، جب بھی سفر سے تشریف لاتے اور احد پہاڑ پر نظر پڑتی تو ایک خاص مسرت ہوتی، سواری کی رفتار بڑھا دیتے اور فرماتے کہ یہ پہاڑ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں ان سے محبت کرتا ہوں۔

یہ محبت اگر جائز اخلاقی اور شرعی حدود میں ہو تو اسلام اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے، بشرطیکہ یہ محبت دل و انصاف اور حق و سچائی کے اعتراف میں رکاوٹ نہ بنے اور عصبیت جاہلیہ کی حد میں داخل نہ ہو جائے اور اسلامی اور انسانی اخوت اس سے مجروح نہ ہو، اسی لئے مسلمان جس ملک میں گئے، وہیں کے ہو رہے، انھوں نے ٹوٹ کر اس ملک سے محبت کی اور ملک کے باشندوں کے ساتھ بھائی بھائی بن کر رہے، مظلوموں کی دستگیری کی، ستم رسیدوں کے پشت پناہ ہوئے، دبے کچلے لوگوں کو اٹھایا، ظالموں سے پنجہ آزمائی کی اور

اخلاقی، معاشی اور سیاسی ہر اعتبار سے ملک کی خدمت کی۔

ہندوستان میں جب مسلمان آئے، تو ملک چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں منقسم تھا، ایک طبقہ نے دوسرے طبقہ کو غلام بنا رکھا تھا، ملک کے باشندوں کی ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی جن کے سایہ کو بھی منحوس تصور کیا جاتا تھا اور جن کو حیوان سے بھی کمتر درجہ حاصل تھا، عورتیں سامان و املاک کے درجہ میں تھیں اور اس ملک میں دور دور تک انسانی وحدت و اخوت کا کوئی تصور تک نہیں تھا، مسلمانوں نے اس ملک کو انسانی وحدت کا عقیدہ دیا، انقسام و تفریق کی دیواریں منہدم کیں، پست کو بالا کیا اور ہر طبقہ کو عزت و احترام عطا کیا۔ سیاسی اعتبار سے متحدہ ہندوستان کا تصور دیا، اقتصادی اور صنعتی اعتبار سے ملک کو ایسی ترقی دی کہ مشرق و جنوب کو اس پر رشک آتا تھا اور اس کو ''سونے کی چڑیا'' خیال کیا جاتا تھا، ملک کے طول و عرض کو ایسے مضبوط قلعے، خوبصورت مقبرے، پرشکوہ مسجدیں، وسیع اور حسین باغات، کشادہ سڑکیں اور یادگار تاریخی عمارتیں دیں کہ وہی آج ہندوستان کی پہچان ہیں اور انہی سے ملک کی تہذیبی اور تاریخی شناخت ہے۔

پھر جب ہندوستان میں انگریزوں نے قدم رکھا اور بتدریج پورے ملک کو غلام بنا لیا، تو پہلے جو لوگ ان کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے، وہ مسلمان ہی تھے، آزادی کی لڑائی میں مسلمانوں نے جس طرح خون دل پیش کئے اور ملک کے تمام طبقوں سے بڑھ کر محبت و وفاداری کا حق ادا کیا، وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار مہر نیم روز کے انکار سے کم نہیں، آزادی کے بعد بھی مسلمانوں نے برادران وطن کے دوش بدوش ملک کی ترقی میں حصہ لیا اور ملک کی حفاظت و مدافعت میں بھرپور کردار ادا کیا ہے، یہ مسلمانوں کی حب الوطنی ہی ہے کہ ملک کے مفاد کے خلاف کام کرنے کے جرم میں جو لوگ پکڑے جاتے ہیں، ان میں مسلمانوں کا تناسب شاید ایک فی صد بھی نہ ہو۔

لیکن یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کی محبت ایمان اور عقیدۂ توحید کے دائرہ ہی میں ہوگی۔ ملک کی محبت ہو یا قوم کی، ماں باپ کی محبت ہو یا بال بچوں کی، ہر محبت حکم خداوندی کی پابند ہے، کسی مسلمان کے لئے یہ بات ممکن نہیں کہ وہ کسی انسان سے خدا اور رسول سے

بڑھ کر محبت کرے، اسی طرح اس کے لئے اس کی بھی گنجائش نہیں کہ وہ کسی جگہ اور مقام سے خواہ وہ اس کا گھر ہی کیوں نہ ہو، حرمین شریفین سے زیادہ محبت رکھے، کسی مسلمان کو اس کا پابند کرنا کہ وہ روئے زمین کے کسی خطہ کو ان مقاماتِ مقدسہ سے زیادہ مقدس اور قابلِ احترام سمجھے، اس سے ایمان و عقیدہ کی آزادی کو سلب کرنا ہے اور ملک کے ایک شہری کی حیثیت سے مسلمانوں ہی کی طرح دوسرے مذاہب کے متبعین کا یہ حق بھی آئین میں تسلیم ہے کہ وہ اپنے مقدس مذہبی مقامات سے محبت و احترام کا خصوصی تعلق رکھیں۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہ محبت اسی حد میں ہو جس کی اسلام اجازت دیتا ہے، اسلام کا سب سے بنیادی رکن عقیدۂ توحید ہے، توحید اس حقیقت کا اقرار و اعتراف ہے کہ پرستش کے لائق صرف خدا ہی کی ذات ہے، خدا کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں اور انسان اللہ کے سوا کسی کا بندہ نہیں، نہ ندی و پہاڑ کا، نہ درخت اور دریا کا، نہ سورج اور چاند کا اور نہ کسی اور مخلوق کا، اس لئے وطن سے ایسی محبت کو اسلام روا نہیں رکھتا جو بندگی اور پرستش تک جا پہنچے اور جس میں محبوب کو معبود کا درجہ دیا جائے۔

اسی پس منظر میں اس نظم کو دیکھنا چاہئے جو "وندے ماترم" کے نام سے معروف ہے، یہ نظم چند چٹرجی کا ترانہ ہے، جو انگریزوں کی خوشامد میں کہا گیا ہے، اسی لئے ملک کے محقق بھی خواہ وہ ہندو ہوں جیسے پنڈت جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، ڈاکٹر لوہیا وغیرہ نے بھی اس ترانہ نظم کو ناپسند کیا ہے اور نظم کے بارے میں مسلمانوں کے اختلاف کے معقول اور مبنی بر حقیقت ہونے کا اعتراف کیا ہے، اس نظم کا آغاز ہی اس مصرعہ سے ہوتا ہے۔

میں تیرا بندہ ہوں اے میری ماں!

پھر آگے یہ مصرعہ آتا ہے:

تو ہی مرا علم ہے، تو ہی مرا دھرم ہے

نظم کا اختتام اس طرح ہوتا ہے:

میں غلام ہوں، غلام کا غلام ہوں

غلام کے غلام کا غلام ہوں

اچھے پانی، اچھے پھلوں والی ماں! میں تیرا بندہ ہوں

اس نظم کے ایک مصرعے میں ہندوستان کو درگا ماتا کا درجہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے:

تو ہی ہے درگا، دس مسلح ہاتھوں والی

اس نظم کے ایک ایک مصرعہ سے واضح ہے کہ شاعر مادر وطن کو محبوب سے آگے بڑھا کر "معبود" کا درجہ دیتا ہے، ظاہر ہے کسی مسلمان سے اس بات کا مطالبہ کرنا کہ وہ اس نقطۂ نظر کو قبول کرے اور وہ اپنے عقیدہ وضمیر کی آواز کے برخلاف مشرکانہ اشعار کو پڑھے، مذہبی تشدد کے سوا اور کیا ہے؟ یہ تو اس کا اعتقادی پہلو ہے، پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ نظم بنیادی طور پر بنگالی ناول "آنند مٹھ" کا حصہ ہے، جس میں ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اکسایا گیا ہے، نفرت کے شعلے بھڑکانے کی کوشش کی گئی ہے اور انگریزوں کی آمد کا خیر مقدم کیا گیا ہے، کیا کوئی محب وطن ہندوستانی ایسے اشعار کو پسندیدگی اور تحسین کی نظر سے دیکھ سکتا ہے؟

ملک کے مختلف صوبوں میں جہاں بھاجپا برسر اقتدار ہے "وندے ماترم" کو اسکولوں میں لانے کی سعی کی جارہی ہے اور عجب نہیں کہ اب کوشش کی جائے کہ پورا ملک اس ترانہ سے گونج اٹھے، لیکن مسلمان کے لئے نہ ان کا مذہب ان اشعار کے پڑھنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ ان کی حب الوطنی اور جمہوریت پسندی ہی ان کے لئے اس کو روا رکھتی ہے!

{۲۴ مئی ۱۹۹۸ء}

اختلاف میں اعتدال

اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں مسلمان ایک نازک موڑ پر کھڑے ہیں، اشتراکی نظام کی تباہی کے بعد پوری دنیا نے اسلام کے خلاف کمر کس لی ہے، اور اس مقصد کے لئے مشرق و مغرب کے دو پرانے حریف و رقیب بھی ایک دوسرے سے ہاتھ ملا چکے ہیں، خود ہمارے ملک میں جن لوگوں کو دریا کے دو کنارے کہا جاتا تھا انھوں نے بھی اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے فاصلے ختم کر لئے ہیں، ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے دو باتیں نہایت ضروری ہیں، ایک اتحاد و اتفاق، دوسرے حکمت و تدبیر۔

اتحاد و اتفاق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امت میں کوئی اختلاف ہی باقی نہ رہے، اختلاف رائے پہلے بھی رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا، اور اس کے باقی رہنے ہی میں خیر ہے، لیکن اختلاف فکر و نظر اتحاد عمل میں مانع ہے، نہ باہمی توقیر و احترام میں، اگر ہم نے اس بات کو نہیں سمجھا تو یہ ایسی بدبختی کی بات ہوگی کہ شاید اس کی تلافی ممکن نہ ہو، اور تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے گی ___ مسلمانوں کے باہمی اختلاف کچھ تو عقائد میں ہے اور زیادہ تر عملی احکام میں، عقائد میں بعض اختلاف یقیناً گمراہی کے قبیل سے ہے، لیکن جو لوگ اہل سنت والجماعت کی راہ سے منحرف ہوں ان کو بھی کافر کہنے میں سلف صالحین نے بہت احتیاط کا ثبوت دیا ہے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کو باوجود ان سے قتال فرمانے کے کافر قرار دینے سے اجتناب فرمایا، معتزلہ سے بعض اعتقادی مسائل میں اختلاف کے باوجود ہم نے ان کی تکفیر سے گریز کیا، اور قدریہ و جبریہ وغیرہ کا شمار تقدیر کے مسئلہ میں اہل سنت والجماعت سے سخت اختلاف کے باوجود بھی مسلمان فرقوں میں کیا گیا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلف کے اختلاف رائے میں کس قدر اعتدال تھا!

خود اہل سنت والجماعت کے درمیان بھی بعض اعتقادی مسائل میں اختلاف رہا ہے، اور یہ عہد صحابہؓ سے ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ شب معراج میں رسول اللہ ﷺ کے باری تعالیٰ کو دیکھنے کے قائل تھے، حضرت عائشہؓ کو اس سے انکار تھا، بعض صحابہؓ اس کے قائل تھے کہ مردہ پر اس کے اہل وعیال کے رونے سے عذاب ہوتا ہے، حضرت عائشہؓ اس کی تردید کرتی تھیں، بعض صحابہؓ کی رائے تھی کہ مردے سنتے ہیں، اور جمہور اس کے قائل نہیں تھے، یہ اختلاف صحابہؓ کے بعد بھی صدیوں اہل علم بلکہ عوام کے درمیان بھی زیر بحث رہا۔

بعد کے ادوار میں جب اسلام کے اعتقادی تصورات کو کلام کے نام سے مرتب کئے گئے تو اصولی مسائل میں اتحاد کے باوجود ان عقائد کی تشریح وتوضیح اور تعبیر وتفہیم میں خاصا اختلاف پیدا ہوا، اور اشعری، ماتریدی اور حنبلی دبستان فکر ابھرے، لیکن اس اختلاف نے بھی جھگڑے اور نزاع کی صورت اختیار نہیں کی، لوگ ایک دوسرے سے حسن اعتقاد رکھتے، ان کی اقتداء میں نماز ادا کرتے، ان کے علم وفضل، ورع اور تقویٰ کا برملا اعتراف کرتے، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس طرح کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلف اس بات پر متفق تھے کہ اس کی وجہ سے کسی کو کافر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اتفقوا على عدم التكفير بذالك (مجموع الفتاویٰ: ۱۲؍۴۹۵)

دوسری قسم کا اختلاف وہ ہے جو فقہی مسائل میں پیدا ہوا ہے، یہ اختلاف عہد نبوی ﷺ سے ہے، اور جو اختلاف صحابہؓ کے دور میں رہا ہے اس کے باقی رہنے میں بہتری ہے، اگر غور کیا جائے تو اس اختلاف کو باقی رکھنا خود اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا منشا ہے، اور یہ بات ادنیٰ غور وتامل سے معلوم ہوسکتی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے وضو میں سر کا مسح کرنے کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے "وامسحوا برؤسکم" یہاں لفظ "ب" استعمال کیا گیا ہے، "ب" کے معنی عربی زبان میں بعض دفعہ کچھ حصہ کے بھی ہوتے ہیں، اور "ب" زائد بھی ہوتی ہے، پہلی صورت میں معنی ہوگا سر کے بعض حصہ کا مسح کرلو، اور دوسری صورت میں معنی ہوگا کہ پورے سر کا مسح کرو، چنانچہ بعض فقہاء پورے سر کے مسح کو ضروری قرار دیتے ہیں، اور دوسری رائے کے مطابق سر کے کچھ حصہ کا مسح کافی ہوگا، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم

میں "ب" کے یہ دونوں معنی پہلے سے موجود ہیں، اگر اللہ چاہتے تو "بعض" کا لفظ استعمال فرماتے اور متعین ہو جاتا کہ پورے سر کا مسح ضروری نہیں، یا "کل" کا لفظ ارشاد فرماتے اور یہ بات پوری طرح بے غبار ہو جاتی کہ پورے سر کا مسح کرنا فرض ہے، لیکن خدائے علیم وخبیر نے اس صراحت کے بجائے اپنی کتاب میں ایک ایسا لفظ ذکر فرمایا جس میں دو معنوں کا احتمال ہے، اس سے ظاہر ہے کہ ایسے مسائل میں اختلاف رائے کا باقی رہنا خود منشاء ربانی ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں عورت کی عدت کے لئے تین "قروء" گذارنے کا حکم دیا گیا ہے، "قرء" کے معنی حیض کے بھی ہیں اور زمانہ پاکی کے بھی، اسی لئے بعض فقہاء نے تین حیض مدت قرار دی ہے اور بعض نے تین پاکی، ظاہر ہے کہ "قرء" کے دونوں معانی اللہ تعالیٰ کے علم محکم میں پہلے سے تھے، اگر اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہوتا کہ احکام شرعیہ میں کوئی اختلاف رائے نہ ہو تو قرآن میں بجائے "قرء" کے صریحاً حیض یا طہر کا لفظ استعمال کیا جاتا، یہی صورت حال احادیث نبوی میں بھی ہے، مثلاً آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حالت اغلاق کی طلاق واقع نہیں ہوتی، اغلاق کے معنی جنون و پاگل پن کے بھی ہیں اور اکراہ و مجبوری کے بھی، چنانچہ اپنے اپنے فہم کے مطابق بعضوں نے ایک معنی کو ترجیح دی ہے اور بعضوں نے دوسرے معنی کو، حالانکہ رسول اللہ ﷺ افصح العرب یعنی عرب کے سب سے زیادہ فصیح شخص تھے، اگر آپ ﷺ چاہتے تو ایسی واضح تعبیر اختیار فرماتے کہ ایک ہی معنی متعین ہو جاتا، دوسرے معنی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ایک ہی واقعہ میں مختلف مواقع پر رسول اللہ ﷺ سے مختلف عمل ثابت ہے، جیسے نماز شروع کرتے ہوئے تکبیر تحریمہ میں کبھی آپ ﷺ نے کانوں تک ہاتھ اٹھایا، کبھی مونڈھوں تک، اور کبھی ان دونوں کے درمیان، دونوں ہاتھ کبھی آپ ﷺ نے ابتداء نماز ہی میں اٹھائے ہیں، کبھی رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد بھی، کبھی دو سجدوں کے درمیان اور دوسرے مواقع پر بھی، ہاتھ آپ ﷺ نے کبھی ناف کے نیچے باندھے ہیں اور کبھی ناف سے اوپر، آمین کبھی آہستہ کہی ہے اور کبھی زور سے، قعدہ میں کبھی پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھے

کسی نے حق و صواب کو ان میں محدود و منحصر نہیں سمجھا۔ اس لئے تمام اختلافی مسائل میں امام ابوحنیفہؒ کی آراء اور شوافع نے امام شافعیؒ کی آراء کے خلاف فتاویٰ دیئے ہیں۔ اور ان مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان بھی کوئی نزاع، جنگ و جدال اور ایک دوسرے کی مذمت و اہانت کی نوبت نہیں آئی۔ بس ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے میں مختلف قومیں دامنِ اسلام میں آئیں، لیکن ان کو کبھی یہ فیصلہ کرنے میں دقت پیش نہیں آئی کہ وہ کس فقہ پر عمل کریں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امت میں دین کے مزاج و مذاق کے بارے میں صحیح فہم تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ دین کے اصول و بنیاد و اساس نہیں ہے، بلکہ یہ ہے مسائل ہیں جن میں ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش ہے، ان میں ایک رائے پر اصرار اور دوسری رائے کے بارے میں انکار و تردید صحیح نہیں، اس لئے انہوں نے اس اختلاف کو کبھی اہمیت نہیں دی، علماء کا تو کیا ذکر، سربراہانِ مملکت جن کا اصل میدان سیاست ہے، ان کا ذہن بھی اس بارے میں بہت واضح تھا۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے اس سلسلے میں مامون الرشید کا ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔ مامون کے زمانے میں ایک شخص عیسائیت کی طرف مرتد ہو گیا۔ مامون نے اس پر سزا جاری کرنے سے پہلے اس کو سمجھانے کی غرض سے دریافت کیا کہ تمہارے مرتد ہونے کا کیا باعث ہوا؟ اس نے کہا کہ آپ کا اختلاف۔ مامون نے کہا کہ ہمارے اختلاف دو طرح کے ہیں، ایک تو جیسے اذان کے کلمات، نماز کی تکبیرات اور تشہد وغیرہ کے بارے میں تو یہ اختلاف نہیں، بلکہ تنگی دور کرنے اور تخفیف کے لئے ہے۔ ایک شخص اذان و اقامت کے دوہرے کلمات کہتا ہے، وہ اس شخص کو برا نہیں کہتا جو اقامت کے اکہرے کلمات کہتا ہے، اور ان قسم کے اختلافات کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو حقیر سمجھتے ہیں اور نہ برا کہتے ہیں، لا یتعنفون بذلک ولا یعنفونہ۔ دوسرا اختلاف وہ ہے جو کسی آیت یا حدیث کی تشریح میں ہوتا ہے، اگر تم کو اس سے وحشت ہے تو تورات و انجیل کی تشریح میں بھی علماء یہود و نصاریٰ متفق نہیں ہیں، کیونکہ جب کوئی بات تفصیل طلب ہوگی تو اس کی تشریح میں یقیناً اختلاف کا امکان ہوگا۔ اگر اللہ کو یہ بات منظور ہوتی کہ ان کے

درمیان کوئی اختلاف نہ ہوتا تو اللہ نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی بات نازل نہ کی ہوتی جو تفسیر و تشریح کی محتاج ہو۔ ماموں کی اس بات نے اس شخص کے ذہن کی گتھی کھول دی، اور وہ فوراً ارتداد سے تائب ہو گیا۔ (عیون الاخبار: ۱۵۲/۲، از جمل الحکمہ بن)

غرض کہ کچھ مسائل میں اختلاف رائے عہد صحابہ سے ہے، یہ اختلاف امت کے لئے رحمت ہے، اور یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے منشاء کے عین مطابق ہے، اس اختلاف کو مذموم سمجھنا سلف کے طریقہ کے بھی خلاف ہے اور عقل سلیم کے بھی مغائر، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اختلافات کے معاملہ میں انسان کا قلب وسیع ہو، تمام سلف صالحین کے بارے میں اس کی زبان محفوظ اور اس کا قلم محتاط ہو، وہ صحابہ و تابعین کے اختلاف کے بارے میں حسن ظن رکھے، اور اختلاف رائے کو برداشت کرے، یہ وہ مسائل نہیں ہیں جن کی امت پر تبلیغ کی جائے، اور اس کو اپنی دعوت کا موضوع بنایا جائے، اسی طرح اعتقادی احکام کی تشریح میں اہل سنت والجماعت کے درمیان جو معمولی سا اختلاف ہے، اور اکثر یہ اختلاف محض تعبیر کا ہوتا ہے، ان میں غلو، اور ان کی بنیاد پر دوسروں کو گمراہ قرار دینا نہایت ہی مذموم اور ناشائستہ بات ہے۔

جیسا کہ ایک زمانہ میں مغرب کی استعماری طاقتوں نے ان غیر اہم مسائل کو مسلمانوں میں اختلاف بھڑکانے اور ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کا ذریعہ بنایا تھا، اسی طرح اس وقت بھی اسلام کے مخالفین اس قسم کے مسائل میں امت کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جس قدر مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہوگا ان کی راہ آسان ہوگی، وقت کی تکبیر کو نہ پہچاننا اور غیر اہم باتوں میں اپنے آپ کو الجھا کر رکھنا کسی قوم کے انحطاط کی علامت ہوتی ہے، ہمیں تاریخ کا یہ واقعہ یاد رکھنا چاہئے کہ جب مسلمان فوجیں صلیبیوں کو شکست دے رہی تھیں تو عیسائیوں کے درمیان اس موضوع پر مناظرہ کا بازار گرم تھا کہ زمین افضل ہے یا آسمان؟ ___ کہیں ہم اسی تاریخ کو دہرا تو نہیں رہے ہیں؟؟

(۱۸/مئی ۲۰۰۱ء)

اختلاف کا طریقہ

امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ امت کے دو بڑے فقیہ صاحب اور صاحب علم اور صاحب فضل بزرگ گذرے ہیں، آج پوری دنیا کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ تعداد امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرنے والوں کی ہے، اس کے بعد حضرت شافعیؒ ہی کے مقلدین کا نمبر ہے، امام شافعیؒ کو ہزاروں مسائل میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے سے اختلاف تھا، لیکن فرماتے ہیں کہ تمام لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کی عیال ہیں۔ (الناس عیال فی الفقه علی ابی حنیفةؒ) یہی امام شافعیؒ ایک بار بغداد آئے، بغداد میں امام ابوحنیفہؒ کی قبر ہے، امام شافعیؒ نماز فجر میں سال بھر قنوت نازلہ پڑھنے کے قائل ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اس کے قائل نہیں، البتہ ایسے خصوصی مواقع پر قنوت نازلہ کی اجازت دیتے ہیں جب مسلمانوں پر کوئی آفت آئی ہو، امام شافعیؒ نے آج نماز فجر میں قنوت نازلہ نہیں پڑھی، لوگوں کو تعجب ہوا، عرض کیا گیا: آج آپ نے دعاء قنوت نہیں پڑھی؟ فرمایا کہ مجھے اس صاحب قبر سے حیا آتی ہے کہ میں ان کے شہر میں بھی ان کی مخالفت کروں، اختلاف کے باوجود اعتراف و احترام کی یہ ایک مثال ہے اور ایسی بہت سی مثالیں مسلمانوں کی تاریخ میں موجود ہیں!

حقیقت یہ ہے کہ اتحاد و اتفاق کی ضرورت سے کسے انکار ہوگا؟ شاید ہی کسی ایسے شخص کو اس سے اختلاف ہوگا، جو خود عقل سے محفوظ ہو، کیا عالم، کیا جاہل، کیا مسلمان کیا غیر مسلم، اس لئے دن رات اتحاد و اتفاق کی اہمیت پر تقریریں بھی ہوتی ہیں، مضامین بھی لکھے جاتے ہیں، بلکہ بڑی بڑی کانفرنسیں اسی مقصد کے لئے منعقد کی جاتی ہیں، اب تو اس کے لئے جلوس اور ریلیاں بھی نکالی جاتی ہیں اور مشاعروں اور سیمیناروں کا بھی

احترام کیا جاتا ہے، یہ بھی بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کس طرح اتحاد و یکجہتی کو قائم رکھا جائے؟

لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ انسانی سماج میں اختلاف کا واقع ہونا بھی ایک ناگزیر بات ہے، جس سے مفر نہیں، اگر سونے چاندی یا مٹی اور پتھر کی مورتی بنادی جائیں، ان کو ایک جگہ بٹھا دیا جائے تو یقیناً اختلاف نہ ہوگا، نہ کوئی اپنی جگہ سے آگے بڑھے گی، نہ پیچھے ہٹے گی، نہ ایک دوسرے کے خلاف اظہار خیال کرے گی، لیکن چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، جیتے جاگتے انسان کو اس طرح متفق اور مہر بلب رکھنا ممکن نہیں، خدا نے بھی جو عقل ودیعت فرمائی ہے، وہ سوچ اور غور و فکر کے بغیر رہ نہیں سکتی، یہی اس کی غذا ہے اور جیسے اللہ نے ناک، کان، رنگ و روپ اور چال ڈھال میں ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے مختلف بنایا ہے، اسی طرح ان کی عقل و فہم کی صلاحیت بھی مختلف ہے اور الگ الگ سمتوں کو لے جاتی ہے، اس لئے ان کے درمیان اختلاف فطری بھی ہے اور ضروری بھی، یہی اختلاف ہے جو انسان میں جذبۂ مسابقت پیدا کرتا ہے، اپنی رائے کی خامیوں کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں انسان کو رواں دواں رکھتی ہے۔

اس لئے جیسے ''اتحاد'' سیکھنے کی ضرورت ہے، اسی لئے ''اختلاف'' بھی سیکھنے کی ضرورت ہے، کہ اگر کسی شخص سے اختلاف ہو جائے تو آپ کا کیا رویہ ہونا چاہئے اور اختلاف کا اظہار کس طرح کرنا چاہئے؟ اور تو جہاں تک ممکن ہو اختلاف سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے، بعض لوگوں کا مزاج بن جاتا ہے کہ جب بھی کوئی ایسی مجلس ہو جہاں مختلف نقطۂ نظر کے حامل موجود ہوں، وہاں ایسی ہی بات سے آغاز کرتے ہیں، جو اختلافی ہو، طنز و تعریض کی زبان استعمال کرتے ہیں اور تمسخر و استہزاء کرکے اپنے مخالفین کو بے آبرو کرنا ہنر خیال کرتے ہیں، یہ محض جہالت کی بات ہے، آپ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں آپ ﷺ کے مخاطب یہود تھے، یہود مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے اور کوئی موقع مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، لیکن قرآن مجید

نے ان سے بھی کہا کہ ایک ایسی بات پر آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان قدر مشترک ہے، یعنی توحید "تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ" (آل عمران: ۶۴) اس لئے مشترک مجلسوں میں اس سے خوب احتراز کرنا چاہئے۔

دوسرے: ہر انسان میں خامیوں کے ساتھ کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں، خدا کی کوئی مخلوق ایسی ناقص نہیں ہو سکتی کہ اس میں خیر اور بھلائی کا کوئی پہلو ہی نہ ہو، ان خوبیوں کا پوری کشادہ قلبی اور فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کرنا چاہئے، یہی اس کے ساتھ انصاف ہے، اس کی خامیوں کو یاد رکھنا اور اس کی خوبیوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے کی کوشش کرنا بھی ناانصافی ہے، قرآن مجید نے اسی لئے ہدایت دی ہے کہ "کسی قوم کی برائی اس کے ساتھ انصاف کا رویہ اختیار کرنے میں مانع نہ ہو جائے" "وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَلَّا تَعْدِلُوْا" زمانہ جاہلیت کا ایک شاعر "امیہ بن صلت" تھا، کافر تھا اور کفر ہی پر اس کی موت ہوئی، اس کے بعض اشعار بڑے اچھے تھے اور حقائق پر مبنی تھے، آپ ﷺ اس کے اشعار کے محاسن کا برملا اعتراف فرماتے تھے۔

تیسری: اہم بات یہ ہے کہ اختلاف برداشت کرنے کی قوت ہونی چاہئے، فرد ہو یا ادارہ، جماعت ہو یا تنظیم، آج کل مسلمانوں میں مشورہ سے گریز کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے، کیوں کہ مشورہ میں اس شخص کی رائے سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے، اس کی رائے کے خلاف بھی فیصلہ ہو سکتا ہے، اس کا محاسبہ بھی ہو سکتا ہے اور اختلاف و احتساب کو برداشت کرنے کی قوت ان میں نہیں رہی، بعض لوگ ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی بداعمالی پر پردہ پڑا رہے اور بعض لوگ اس کو وقار کا مسئلہ سمجھتے ہیں، یوں تو اخلاص کا تعلق دل سے ہے، لیکن اپنے آپ کو "احتساب کے لئے تیار رکھنا" اخلاص کو جانچنے کی کسوٹی ہے، جس کا کام خدا کے لئے ہو، اس کو یہ فکر نہ ہوگی کہ اس کی رائے چلے اور نہ اسے اپنے احتساب سے خوف ہوگا، بلکہ وہ اسے پسند کرے گا کہ دنیا میں ہی حساب ہو جائے، تاکہ آخرت میں اس کا حساب آسان ہو۔

چوتھے: اختلاف میں بھی تحمل و محبت کا انداز ہونا چاہئے، نہ کہ اہانت کا، رسول اللہ ﷺ کو

کسی فن کو ترقی پر تشجیع کرنا ہوتی تو اس میں محبت کا رنگ غالب ہوتا، اگر کسی کی انفرادی کوتاہی پر نکیر کرنی ہوتی تو تنہائی میں بلا کر سمجھاتے، اگر مختلف لوگ ایک غلطی میں مبتلا ہوتے تو کسی کا نام لئے بغیر متوجہ فرماتے، تاکہ کسی کی اہانت نہ ہو، لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ کسی سے اختلاف ہو تو اس کی ایک ایک کمزوری کو تلاش کرتے ہیں اور پھر اپنی طرف سے اس میں اضافہ کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس قدر بدنام ہوجائے کہ کہیں منہ دکھانے کے لائق باقی نہ رہے!

بدقسمتی سے آج اختلاف مسلمانوں کی پہچان ہوگئی ہے، کوئی تنظیم ہو، ادارہ ہو، جماعت ہو، تحریک ہو، مسجد ہو، مدرسہ ہو، گھر ہو کہ خاندان کا معاملہ ہو، ہر جگہ دل ٹوٹے ہوئے اور کینہ و عداوت سے بھرے ہوئے، کیوں کہ جو لوگ کسی ذمہ داری پر فائز ہیں ان میں اختلاف برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں اور جو لوگ ان کے ماتحت ہیں، ان میں اختلاف کا سلیقہ نہیں، اختلاف کا یہ انداز قدم بہ قدم قوم کی ترقی میں رکاوٹ ہے، کاش! ہم اختلاف کے ساتھ اختلاف کا طریقہ سیکھیں اور ایک ایسے وقت میں جب کہ ہر چہار سمت سے عداوت و حسد کے تیر اس امت پر برس رہے ہیں، ہم اپنے ہاتھوں اپنی بے آبروئی کا سروسامان نہ کریں!!

(۲۸؍ اپریل ۲۰۰۰ء)

بخش دو گر خطا کرے کوئی!

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (متوفی ۶۲۷ھ) ان بزرگوں میں ہیں جن کے مسکن ہونے پر ہندوستان کو بجا طور پر فخر ہے۔ ان کی انسانیت دوستی اور خلاق و مروت کی وجہ سے ہر مذہب کے لوگ ان کے گرویدہ تھے۔ انہوں نے ایک ایسے علاقہ میں اپنی درویشی کا تخت بچھایا اور رشد و ہدایت کی محفل آراستہ کی، جہاں کی تندخوئی اور درشت طبعی ضرب المثل تھی اور آج بھی ایک حد تک ان کی یہ شناخت قائم ہے، یہ آپ کی نرم خوئی اور کریمانہ اخلاق ہی کی دین ہے کہ تلوار سے بھی جن گردنوں کو خم کرنا دشوار تھا، آپ کے ہاتھوں میں ان کا دل موم ہو جاتا تھا، ہندو ہوں یا مسلمان سب آپ کے معتقد تھے، لاکھوں اشخاص نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور فسق و فجور سے تائب ہوئے۔

خواجہ صاحبؒ کا ایک نمایاں وصف عفو و درگزر تھا، ایک دفعہ ایک شخص کسی کے بہکاوے میں آکر آپ کے قتل کے درپے ہو گیا اور اسی ارادے سے حاضر مجلس ہوا۔ کسی طرح آپ نے اس کا ادراک کر لیا، آپ نہایت سیر چشمی سے ملے، خلاق سے پیش آئے، پھر فرمایا کہ جس ارادہ سے آئے ہو اسے پورا کر لو، وہ بہت کانپنے لگا، بغل سے چھری نکال کر سامنے رکھ دی اور قدم بوس ہو کر عرض گزار ہوا کہ مجھے میری غلطی کی سزا دیجئے، بلکہ مجھے ہی قتل کر دیجئے، آپ نے فرمایا: ہم درویش تو تکلیف پہنچانے والوں اور برائی کرنے والوں کو بھی کوئی تکلیف نہیں پہنچاتے، تم نے تو کوئی برائی کی ہی نہیں، آخر اس شخص نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور زندگی میں ایسی تبدیلی آئی کہ یا تو لوگوں کے جان و مال کے درپے رہتا تھا یا ایسا خدا ترس اور عبادت گزار ہوا کہ متعدد بار حج کی زیارت سے

سرفراز ہوا۔

جانی دشمنوں کو معاف کرنے اور اخلاق کی تلوار سے قول و دو آہن کی تلوار کو مفتوح کرنے کی یہ ایک مثال ہے۔ صحابہ کرامؓ، داعیانِ اسلام اور صوفیاء و عارفین کی زندگی میں ایسی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔ "معاف کرنا" بولنے میں ایک آسان لفظ ہے، لیکن عملی زندگی میں یہ ایک دشوار کام ہے۔ جانی دشمنی کے درپے ہونا تو بڑی بات ہے معمولی سے بے توقیری یا زمین و جائیداد اور روپے پیسے کا جھگڑا بھی انسان کو آتش فشاں بنا دیتا ہے، جب انتقام کی آگ سلگتی ہے تو انسان اپنے آپ میں نہیں رہتا، بے قابو ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی وقت میں اپنے آپ کو قابو میں رکھنا کمال ہے۔

دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق ؓ حق کے معاملہ میں بہت پُرجوش واقع ہوئے تھے، کوئی غلط بات دیکھتے تو برداشت نہ کر سکتے، اسی لیے حضور ﷺ فرماتے تھے کہ عمر جس راہ سے جاتے ہیں، شیطان اس سے کترا کر نکل جاتا ہے۔ حضرت عمر ؓ کا معمول تھا کہ روزانہ شب میں گشت فرماتے تھے کہ لوگوں کے حالات اور ان کی ضروریات سے واقف ہو سکیں، ایک دن نکلے تو ایک مکان سے نغمہ و سرود کی آواز سنی، ذرا جھانکا تو دیکھا کہ جام و سبو کا دور بھی چل رہا ہے، حضرت عمر ؓ سے صبر نہ ہو سکا اور دیوار پھاند کر اندر آ گئے اور کہا کہ دشمنِ خدا! تو شراب بھی پی رہا ہے اور گانے بھی باندی سے سن رہا ہے! وہ صاحب بھی حضرت عمر ؓ کے مزاج سے واقف تھے، عرض کیا کہ امیر المؤمنین! کچھ عرض کرنے کی اجازت ہے؟ آپ ؓ نے اجازت مرحمت فرمائی، کہنے لگا: مجھ سے دو غلطیاں ہوئی ہیں اور آپ سے قرآن مجید کے تین احکام کی خلاف ورزی ہوئی ہے، قرآن نے تجسس سے منع کیا ہے (الحجرات۔ ۱۲) آپ نے میری کوتاہیوں کی بابت تجسس کیا، قرآن مجید نے کہا ہے کہ کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہو، (النور۔ ۲۷) آپ بلا اجازت داخل ہو گئے، قرآن نے کہا ہے کہ دروازے سے آؤ، (البقرہ۔ ۱۸۹) آپ دیوار پھاند کر آ گئے، حضرت عمر ؓ کا غصہ کافور ہو گیا اور فرمایا کہ کیا میں ان تین باتوں کی وجہ سے تمہاری دو باتوں کو نہ معاف کر دوں، اس شخص نے اثبات میں جواب دیا

اور آپ واپس تشریف لے آئے، اس پر حضرت عمر کے صبر و حلم اور عفو و درگذر کا گہرا اثر ہوا اور اپنی خراب عادتوں سے توبہ کر لی۔

یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، وہ شخص کہ جس کے نام سے روم و فارس کے ایوانِ حکومت لرزہ براندام ہو جاتے تھے، خود حکم ربانی کے سامنے آتے ہی سر تسلیم خم کر دیتا تھا۔ رضی اللہ عنہ

غصہ اور جذبۂ انتقام پر صبر و حلم کو غالب رکھنے کا نام عفو و درگذر ہے، ایک ایسا شخص جو کوئی بدسلوکی کرنے والے پر قابو رکھتا ہو، وہ اسے کچل سکتا ہو، اس سے بدلہ لے کر بلکہ جائز انتقام کی حد سے تجاوز کر کے اپنی پیاس بجھا سکتا ہو، خیال کرے کہ وہ صبح و شام اور دن و رات اللہ کا حکم بجالانے میں کوتاہی کرتا ہے، خدا کتنا قادر مطلق ہے اور کیسی بے پناہ قدرت و طاقت رکھتا ہے، پھر بھی اس نے کس طرح نافرمان اور سرکش بندوں کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے رکھا ہے، اگر ہم خدا کے ایک بندے کے ساتھ درگذر کا معاملہ کریں تو خدا کا سایۂ درگذر ہم پر اور بھی دراز ہو جائے گا، تو اس طرح اس کے لئے معاف کرنا آسان ہو جائے گا، ایک بار ایک صحابی کسی غلطی پر اپنے غلام کو مار رہے تھے، آپ ﷺ کی نگاہ پڑی، آپ ﷺ نے آواز دی اور فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور ہاں، یاد رکھو کہ تم کو اس غلام پر جتنی قدرت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے، یہ سننا تھا کہ وہ صاحب کانپ گئے اور کہا کہ میں نے اس کو آزاد کر دیا۔

جب انسان کسی معاملہ کو اپنے اور دوسرے کے درمیان رکھ کر سوچتا ہے، تو غصہ بڑھتا ہے اور انتقام کی چنگاری شعلہ بن اٹھتی ہے اور وہی شخص جب اپنے اور اپنے بھائی کے درمیان خدا کو رکھ کر سوچتا ہے تو غضب کی آگ محبت کی شبنم میں تبدیل ہو جاتی ہے اور معاف کرنا نہ صرف آسان ہو جاتا ہے، بلکہ اس میں ایک لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔

عام طور پر لوگ خیال کرتے ہیں کہ کڑوی گسیلی برداشت کر لینے میں بے عزتی ہوگی، رعب و وقار جاتا رہے گا، بدباطن لوگ بھی اس طرح کی بات کہہ کر اکساتے ہیں اور آگ پر تیل چھڑکتے ہیں، پیغمبر اسلام سے بڑھ کر نفسیات سے کون واقف ہوگا، اسی طرح

کی نفسیات کے عین مطابق آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو معاف کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھا دیتے ہیں۔ یہ بڑی اہم بات ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے، ایک تو اس شخص کی تسکین ہوتی ہے جو غصے پر قابو پانا چاہتا ہے، دوسرے یہ حقیقت بھی ہے کہ تند مزاج کا غلبہ ظاہری اور عارضی رعب قائم ہو جائے، لیکن ہر شخص کا دل اس سے نفرت کرتا ہے اور صابر و حلیم کو وقتی طور پر بے عزتی کو گوارا کر لے، لیکن دلوں پر اس کی محبت کا نقش ثبت ہوتا ہے اور معاشرے میں اس کی عزت بڑھ جاتی ہے۔

(۳۱/اپریل ۲۰۰۰ء)

صبر خوش تدبیری ہے نہ کہ بزدلی

انسان کا جسم کتنی ہی بیماریوں کا مخزن ہے، یہ بیماریاں ہی ہیں جو انسان کو اس کے عجز و ناطاقتی کا احساس دلاتی رہتی ہیں، اور بہت سے غفلت شعار قلوب و اذہان کے لئے بھی خدا کو یاد کرنے کا سامان ہیں۔ ان ہی بیماریوں میں ایک مشہور اور طبیعاتی آلودگی کی وجہ سے آج کل کثیر الوقوع بیماری وہ ہے جسے "الرجی" اور "حساسیت" کہتے ہیں، اطباء کا خیال ہے کہ جسم میں بعض اجزاء قوتِ برداشت کھو دیتے ہیں، جیسے ہی کوئی بیرونی اور ناموافق چیز جسم میں داخل ہو، یہ فوراً حرکت میں آ جاتی ہے اور غیر معمولی ردِ عمل ظاہر کرتی ہے، پھر تو مریض کا حال نہ پوچھئے، چھینکوں کا ایک طوفانی سلسلہ، "ناک اور آنکھ سے گویا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے"، پھر سینہ، حلق اور پیشانی تک جسم کی نسیں کھنچتی ہیں، اور دنوں، ہفتوں کھانسی کہ مریض بے حد بے چین ہوتا ہے، یہ بڑی تکلیف دہ بیماری ہے، بلکہ بہت سی بیماریوں کا سرچشمہ ہے۔

جیسے جسمانی سطح پر الرجی انسان کو کمزور کر دیتی ہے، اور اس کے معتدل کیفیت کو زیر و زبر کر کے رکھ دیتی ہے، اسی طرح قومیں بھی "الرجی" سے دوچار ہوتی ہیں، بعض قوموں اور گروہوں میں برداشت کی قوت ختم ہو جاتی ہے اور ردِ عمل کی کیفیت بڑھ جاتی ہے، وہ بات بات پر مشتعل ہوتی ہے، مخالفین کا ایک بیان جو ان کو برہم کر دیتا ہے، اور بے برداشت ہونے کی وجہ سے انکی جذباتیت کا ان سے مظاہرہ ہوتا ہے، جس کا نقصان خود ان کو پہنچتا ہے، ایسی قومیں دشمنوں اور بدخواہوں کی سازشوں کا شکار ہو کر اپنے حقیقی مسائل کی طرف توجہ نہیں دے پاتیں، ہمیشہ ردِ عمل میں الجھی رہتی ہیں، دوسری قومیں

تعلیمی، معاشی اور دوسرے پہلوؤں سے آگے بڑھتی رہتی ہیں، اور بے شمار وقت مشتعل مزاج قوم ماتم و زاری اور سینہ کوبی میں گذار دیتی ہیں۔

ہندوستان میں مسلمان اس وقت ان ہی حالات سے گذر رہے ہیں، ہم ایک طرح کی قومی الرجی میں مبتلا ہیں، ہمیں مشتعل کرنے کے لئے بے بنیاد افواہیں بھی کافی ہیں، ایک غیر معروف شخص بھی اگر کوئی معاندانہ بات کہہ دے، تو ہم لمحوں میں سڑک پر آجاتے ہیں، اور اس شدت سے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں کہ معمولی شخص ہیرو بن جاتا ہے، اور معمولی تحریریں جن کی اصل جگہ ردی کی ٹوکری ہے، تجسس میں قبول عام و خاص حاصل کر لیتی ہیں، اس مزاج کا نتیجہ یہ ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں ہم نے پایا بہت کم ہے اور کھویا بہت زیادہ ہے، کچھ چیزیں یقیناً ایسی ہیں جن کے بارے میں حکومت سے ہمارا شکوہ بجا ہے، لیکن بہت سی چیزیں وہ ہیں جنہیں حاصل کرنے میں ہم حکومت کے محتاج نہیں ہیں، مسلمانوں میں خواندگی کی شرح سب سے کم ہے، ہماری خواتین کا تعلیمی تناسب کم نہیں، کمترین ہے، معمولی اور اوسط درجے کی تجارت جو سرکاری اجازت سے متعلق نہیں ہیں، ان میں بھی ہم بہت پسماندہ ہیں، زراعت میں نئے وسائل کے استعمال کی اہمیت کو اب تک ہم نے نہیں سمجھا ہے، حکومت کے بہت سے فلاحی پروگرام ہیں، اور بعض فلاحی پروگرام بین الاقوامی تنظیموں کے تحت انجام پاتے ہیں، مسلمان ان فلاحی پروگراموں سے بھی واقف نہیں، ان کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔

حالانکہ مسلمانوں کے پاس بہترین ذہانتیں ہیں، افرادی وسائل ہیں، وہ اس ملک کی دوسری بڑی اکثریت ہیں، مسلمان مزدوروں اور ہنرمندوں کے بیرونی ممالک میں جانے سے ان کی معاشی حالت میں بھی فرق آیا ہے، مذہب سے جتنا تعلق آج بھی مسلمانوں کو ہے کسی اور قوم کو نہیں ہے، لیکن کیا وجہ ہے کہ ہماری پسماندگی کا کوئی علاج نہیں ہو پاتا ــــــ اس کی ایک اہم وجہ یہی اشتعال اور تحمل و برداشت کا فقدان ہے، ہم وقتی حالات پر اتنا سخت ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں، کہ ہماری پوری قوت، صلاحیت یا اس کا بڑا حصہ دفاعی کوششوں میں گذر جاتا ہے، اور ہم کوئی طویل المدت دور رس اثر کی حامل ٹھوس اور تعمیری

منصوبہ بندی نہیں کر پاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ سیاسی حالات کی ناموافقت نے مسلمانوں کو ایک نئی راہ دکھائی ہے، اور اب انہوں نے دوسروں کے سہارے جینے کے بجائے خود اعتمادی کے ساتھ جینے کا حوصلہ سیکھا ہے، بحمد اللہ پورے ملک میں مسلمان ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ اور فنی تعلیم کی طرف متوجہ ہیں، دینی تعلیم کی طرف بھی رجحان بڑھا ہے، ملازمت سے مایوس ہو کر تجارت کی طرف ان کے قدم بڑھ رہے ہیں، اور سیاست کی سنگلاخ وادی میں آبلہ پائی کرنے کی بجائے اب ان کی توجہ ایک طرف اگلی نسلوں کے ایمان کی حفاظت اور دوسری طرف تعلیم اور معیشت کی طرف ہو رہی ہے، یہ صورتِ حال فرقہ پرست قوتوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہی ہے اور وہ اس بات کے لئے سرگرداں ہیں کہ اس قوم کو دوبارہ اسی بیماری میں مبتلا کریں، اسے مشتعل کریں، اس کے جذبات کو اکسائیں، اس کی انا کو ٹھیس لگائیں، اس کو بے برداشت کریں، تاکہ تعمیر سے اس کا ذہن ہٹ جائے، اور یہ قوم اسی ڈور کو سلجھانے میں لگ جائے جس کے سلجھنے کا اسے ایک پائی بھی فائدہ نہیں، اور جس میں اس کی انرجی اور صلاحیت کا بڑا حصہ ضائع ہو کر رہ جائے۔

ادھر کبھی وی، ایچ، پی کی طرف سے مسجد اور مندر کے مسئلہ کو گرم کرنے کی کوشش کی گئی، کبھی بجرنگ دل نے علانیہ مسلمانوں کے خلاف عسکری تربیت کے کیمپ قائم کئے، کبھی بیان دیا گیا کہ مسلمانوں پر نظر رکھی جائے گی، جناب بال ٹھاکرے نے مسلمانوں کو سانپ کہا، اور ان کی گرفتاری کے مسئلہ کو بھی پرجوش اور پرخروش بنانے کی کوشش کی گئی، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے ان خبروں کو اخبار میں پڑھا، ریڈیو سے سنا، اور دیکھی ان دیکھی اور سنی ان سنی کر دی، مسلمان قائدین نے بھی مسئلہ کو سڑک پر لانے کے بجائے صحافتی بیانات اور حکومت کو توجہ دلانے پر اکتفا کیا، اس طرح بات آئی گئی ہو گئی، ورنہ یہ چنگاری آتش فشاں بننے کے لئے کافی تھی، مسلمان نوجوان سڑکوں پر آتے، فسادات ہوتے، مظلوم اور بے کس مسلمانوں پر پولیس مشقِ ناز کرتی، مجرم ان کی بے بسی پر قہقہے لگاتے، اور مظلوم مصیبت زدہ خاندانوں میں ماتم جاری رہتے۔ ان اشتعال انگیز بیانات کا اصل مقصد یہی

جیسے یہ بات افراد کے بارے میں کہی جا سکتی ہے، یہی بات قوموں اور گروہوں کے بارے میں بھی ہے تو یہ جانتا ہو کہ جو قوم دوسروں کے سامنے کوتاہی سے گڑگڑاتی رہتی ہے اور محض نا انصافی کا رونا روتی رہتی ہے، وہ دنیا میں بھی ذلیل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی توجہ بھی اس کی طرف سے ہٹ جاتی ہے، اور جو قوم اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے ناموافق باتوں کو برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھتی جاتی ہے، کامیابی اس کے قدم چومتی ہے، اور اللہ کی رحمت اس پر سایہ فگن رہتی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ایک بار صبر کرنے والوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے لئے امن اور ہدایت ہے: "اولئک لهم الامن وهم مهتدون" (مجمع الزوائد ۱۰/۲۸۷) یعنی صبر کی وجہ سے امن و امان کی حالت رہتی ہے، اور وہ صحیح راہ پر گامزن رہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے مکی زندگی میں اسے برت کر دکھایا، مکی زندگی میں صحابہ بار بار قتال کی اجازت مانگتے لیکن آپ ہمیشہ صبر کی تلقین فرماتے رہے، مدینہ میں منافقین نے مسلمانوں کو کس طرح دق کیا، اور بغلی دشمن کا کردار ادا کیا، حضرت عمرؓ نے بعض منافقین کو قتل کرنے کی اجازت چاہی، جہاں مسلمان طاقت ور موقف میں تھے، اور وہ منافقین کو کیفر کردار تک پہنچا سکتے تھے، لیکن آپ ان کی حرکتوں اور ایذا رسانیوں کو برداشت کرتے رہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر انہیں قتل کیا جائے تو لوگ ان کے نفاق سے واقف نہیں ہیں، عرب کہیں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں پر ہاتھ اٹھاتے تھے، اب طاقت ہوئی تو اپنوں پر تلوار اٹھانی شروع کر دی، صلح حدیبیہ بظاہر آپ نے دب کر فرمائی، کہ پرجوش صحابہ کو بھی یہ صلح ناگوار خاطر تھی، اور محض آپ ﷺ کے عزم سے وہ خاموش تھے، اس صلح کو سبوتاژ کرنے کی بھی کوشش کی گئی، چالیس مشرکین کے جتھے نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا، وہ گرفتار کئے گئے، اور آپ ﷺ نے انہیں یونہی رہا فرما دیا، کیونکہ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ ہر قیمت پر اہل مکہ سے تعلقات بہتر ہوں، تاکہ وہ قریب سے اسلام کو دیکھ اور سمجھ سکیں، فتح مکہ کے موقع سے بھی آپ نے جو عفو و درگزر سے کام لیا، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عربوں کے درمیان خونریزی کی جو رسم تھی، اس سلسلہ میں مسلمانوں

کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔

غرض، غور کیجئے تو آپ ﷺ کی پوری زندگی صبر سے عبارت ہے، جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنے اصل کام سے غافل اور دور نہ ہو جائیں، یہی صبر ہے جس کی ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو ضرورت ہے، ہم بزدل اور کم ہمت نہ ہوں، ہم کوتاہ حوصلہ اور بے غیرت بن کر نہ جئیں لیکن ہم اپنی فراستِ ایمانی کی آنکھ کو کھلی رکھیں، اور دشمن کی سازش اور منصوبہ بندی کو سمجھیں، اور دوسرے کے ہنگامے سے متاثر ہو کر راستہ میں اس طرح نہ الجھ جائیں کہ کبھی ہماری منزل نہ آسکے، اسی خوش تدبیری اور معاملہ فہمی کا نام "صبر" ہے۔

(۲۵/اگست ۲۰۰۰ء)

صلح کرانا ــــ ایک اہم اسلامی فریضہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک جیتا جاگتا، ہنستا بولتا، اور چلتا پھرتا وجود عطا کیا ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے، غور وفکر کا ملکہ ودیعت فرمایا ہے، اور ارادہ واختیار کی قوت سے اسے نوازا گیا ہے، اس لئے کسی بھی انسانی سماج سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ اس میں اختلاف پیدا نہ ہو اور وہ پتھر کی مورتوں کی طرح خاموش اور بے جذبات رہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سوچنے کے انداز میں فرق رکھا ہے، ذوق ونظر کا اختلاف بھی پایا جاتا ہے اور مفادات میں ٹکراؤ بھی، پس کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف کا وقوع پذیر ہونا فطری بات ہے، اور اس سے کوئی مفر نہیں، اگر یہ اختلاف خلوص اور نیک نیتی پر مبنی نہ ہو بلکہ ضد، انا اور خود غرضی کی وجہ سے ہو تو یہ مہذب اور شائستہ اختلاف رائے کی حدوں سے گذر کر باہمی جنگ وجدال، تہمت اندازیوں اور الزام تراشیوں کا باعث بن جاتا ہے، معاشرہ میں ہمیشہ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں اور پیش آتے رہیں گے۔

سوال یہ ہے کہ ایسی نزاع اور اختلاف کا حل کیا ہے؟ ــــ قرآن اللہ کی کتاب ہے، جو زندگی کے ہر گوشہ میں انسان کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے، اس نے یقیناً اس سلسلہ میں بھی رہنمائی کی ہے ــ کسی بھی نزاع سے بنیادی طور پر تین طبقے متعلق ہوتے ہیں، دو فریق تو وہ جو باہم ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوں، اور تیسرے وہ سماج اور معاشرہ جس میں اس طرح کی نزاع پیش آئی ہو، قرآن کی نگاہ میں فریقین کی ذمہ داری یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں دونوں ایک دوسرے سے قریب آنے کو تیار نہ ہوں اور وہ اپنے

طور پر اس فاصلہ کو سمجھنے اور اس خلیج کو پاٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو دونوں فریق اپنی صف سے کسی مخلص، دیندار، سمجھدار اور معاملہ فہم آدمی کا انتخاب کریں اور ان کو اپنا "حَکَم" مان لیں، یہ دونوں حَکَم کی حیثیت سے جو بھی فیصلہ کریں اسے دونوں فریق قبول کریں، اور حَکَم حضرات کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان دونوں فریق کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی بھرپور سعی کریں، قرآن کہتا ہے کہ اگر حَکَم حضرات بے غرض، نیک نیتی اور صدق دلی کے ساتھ صلح کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کو کامیابی سے ہمکنار فرمائیں گے: "إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا" (النساء: ۳۵)

صلح در باہمی اختلاف کو دور کرنے کا یہ نہایت بہترین طریقہ ہے، بلکہ یہ اختلافات سے باہر آنے کا باعزت راستہ ہے، اس لئے کہ اس میں نہ کسی فریق کی فتح ہے اور نہ کسی فریق کی شکست، اس سے سماج میں بھی انسان کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی جو دولت حاصل ہوتی ہے وہ ان سب سے بڑھ کر ہے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے "انا" کے خول سے باہر آئے، بڑائی کے احساس سے اپنے ذہن کو فارغ کرے، اپنے بھائی کو حقیر نہ سمجھے، اس کے اندر حق کو قبول کرنے کی جرأت ہو، اور اس کی نگاہ خود غرضی کی دیوار کو پھاندنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

تیسرا طبقہ جو دو مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتا، وہ ہمارا سماج ہے، یہ سمجھنا کہ یہ فلاں اور فلاں شخص کا اختلاف ہے، ہمیں اس میں پڑنے کی کیا ضرورت؟ یہ صحیح فکر اور مثبت سوچ نہیں، مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ جب وہ دو افراد کے درمیان آویزش اور اختلاف محسوس کریں تو ان میں صلح کرانے اور شکستہ دلوں کو جوڑنے کی کوشش کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، لہٰذا اپنے دو بھائیوں کے درمیان میل ملاپ کرا دیا کرو: "إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ" (الحجرات: ۱۰) یہ نہایت اہم فریضہ ہے، افسوس کہ مسلمانوں کو اس کی اہمیت اور سماج کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا نہ ادراک ہے اور نہ احساس۔

حضرت ابو الدرداءؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تم کو روزہ،

صدقہ اور زکوۃ سے بھی افضل چیز نہ بتاؤں؟ ہم لوگوں نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ ہے باہمی خلش کو دور کرنا اور صلح کرانا، اصلاح ذات البین، آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آپس میں تعلقات کا بگاڑ مونڈ دینے والی چیز ہے۔ (الادب المفرد، حدیث نمبر ۳۹۱)

"مونڈ دینے والی چیز" سے مراد یہ ہے کہ یہ چیز صفایا کر دینے اور جڑ و بنیاد برباد کر دینے والی ہے، خود رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے اور ان کے باہمی اختلافات کو رفع کرنے کا کس قدر پاس و لحاظ تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ باوجودیکہ نماز میں جماعت کا آپ کو صد درجہ اہتمام تھا، یہاں تک میدان جنگ میں بھی غیر معمولی حالات کے بغیر آپ ﷺ کی جماعت نہیں چھوٹی تھی، اور مرض وفات میں اس وقت بھی آپ ﷺ نے جماعت میں شرکت کا اہتمام فرمایا، جب خود چلنے کی طاقت بھی باقی نہیں رہی، لیکن اس کے باوجود قبیلۂ بنی عمرو بن عوف میں ایک جھگڑا رفع کرنے اور مصالحت کرانے کے لئے آپ اپنے رفقاء کے ساتھ بنفس نفیس تشریف لے گئے اور اس فریضۂ مصالحت میں اتنی تاخیر ہوگئی کہ حضرت بلال ؓ نے حضرت ابوبکر ؓ کو امامت کے لئے آگے بڑھایا، نماز شروع ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ (بخاری حدیث ۲۹۹) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ کی نگاہ میں مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کی کیا اہمیت تھی؟

مدینہ میں انصار کے دو مشہور خاندان اوس اور خزرج آباد تھے، رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے یہ ہمیشہ باہم دست و گریباں رہتے تھے، اسلام ان کے لئے ابر رحمت بن کر آیا، اور صدیوں سے عداوت کی جو آگ بجھنے نہ بجھتی تھی، وہ لمحوں میں سرد ہو کر رہ گئی، اور دونوں قبیلے اخوت اسلامی کے رشتہ سے شیر و شکر ہو کر رہنے لگے، یہودیوں کو ان قبائل کا اتحاد اور آپسی محبت ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، ایک بار ایک سن رسیدہ یہودی اوس و خزرج کے لوگوں کے پاس سے گذرا اور ان کی باہمی محبت دیکھ کر بڑا رنجیدہ ہوا، چنانچہ اس نے اوس و خزرج کی لڑائی کے پرانے قصے چھیڑ دئے اور اس زمانہ میں دونوں قبیلے کے شعراء نے ایک دوسرے کے خلاف مذمت کے جو اشعار کہے تھے ان کا بھی ذکر نکالا، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے نوجوان اٹھ کھڑے ہوئے، اور ان کی جاہلی حمیت لوٹ آئی، رسول اللہ ﷺ

کو پہلے ہی اس کی اطلاع مل گئی، بہت تیز تیز تشریف لائے اور لوگوں کو شیطان کی اس دسیسہ کاری سے باخبر کیا، اسی موقع سے سورۂ آل عمران کی یہ آیتیں نازل ہوئیں:

> اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تم پر اسلام ہی کی حالت میں موت آنی چاہئے۔ سب مل کر اللہ کی ڈوری کو تھام لو، پھوٹ نہ پیدا کرو، اور اپنے اوپر اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ تم آپس میں دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، اور تم اللہ کے کرم سے بھائی بھائی بن گئے، نیز تم دوزخ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے، تو اللہ نے تم کو اس سے نکالا، اللہ تعالیٰ اسی طرح تم لوگوں کو احکام بتاتے رہتے ہیں، تاکہ تم ہدایت پر قائم رہو۔ (آل عمران: ۱۰۲-۱۰۳)

— زبان مبارک سے ان آیتوں کا سننا تھا کہ دلوں کی کایا پلٹ گئی، لوگوں نے اپنے ہتھیار پھینک دیئے، اور ایک دوسرے سے گلے مل کر خوب روئے۔ (طبرانی: ۳/۳۰)

غرض، کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف و نزاع کا پیدا ہونا ایک فطری چیز ہے، جس سے بچنا ممکن نہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ جہاں آگ لگے وہاں پانی ڈالنے والے لوگ بھی موجود ہوں، جہاں سیلاب آتا ہے تو وہاں ہر شخص پانی کی ظالم موجوں کے آگے بند باندھنے کی کوشش کرتا ہے، ورنہ آگ پوری بستی کو اپنا لقمہ بنانے گی، اور سیلاب پوری آبادی کو غرقاب کر کے رہے گا، اس لئے مسلمانوں میں جو 'ارباب حل و عقد' ہوں، یعنی ذمہ دار، سمجھدار، بااثر اور اہل علم و دانش، علماء و مشائخ، مذہبی اور سماجی قائدین، دینی تنظیموں اور جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلم معاشرہ میں ابھرتے ہوئے اختلاف کی بروقت تشخیص کریں، اس کے اسباب و عوامل کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور ان کے تدارک کی طرف متوجہ ہوں، ورنہ یقیناً عنداللہ وہ اس سلسلہ میں جواب دہ ہوں گے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کم سے کم ہندوستان میں مسلمانوں کے جتنے تعلیمی، اصلاحی اور دعوتی ادارے ہیں، مذہبی اور سیاسی جماعتیں اور تنظیمیں ہیں، اصلاحی تحریکیں ہیں، ان میں سے اکثر اختلاف و انتشار سے دوچار ہیں، یہ جماعتیں اور تنظیمیں دولخت بلکہ سہ لخت

ہوچکی ہیں، ایک تنظیم کے دو ٹکڑے، اور پھر ان ٹکڑوں کے کئی ٹکڑیاں، اسی اختلاف و انتشار اور مصلحتوں کا ہزاروں بہ حیثیت مجموعی ملت کی طاقت کو کمزور اور بے اثر کردیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم ہر سطح پر مسلمانوں کی پسماندگی اور زبوں حالی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کررہے ہیں، کسی بھی جمہوری ملک میں سیاسی احوال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، خاص کر اقلیتوں کے لئے ان کے ووٹ کی بڑی اہمیت ہے، اگر مسلمان سیاست کی ترازو میں بے وزن ہوجائیں تو اس ملک میں کوئی بھول کر بھی ان کو پوچھنے والا اور داشک شوئی کرنے والا نہ ہوگا، اور اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ووٹ کی قیمت ایک اٹل حقیقت ہے جس کا دوست دشمن سبھوں کو اقرار ہے، لیکن افسوس کہ مسلم جماعتوں کی باہمی آویزشوں اور اختلاف نے ان کو بے وزن کرکے رکھ دیا ہے، اس لئے ان حالات میں سربرآوردہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مختلف مسلم جماعتوں کی باہمی رقابتوں کا قابل قبول حل تلاش کریں ان کو ایک میز پر جمع کریں اور ان کو اختلاف کے باوجود اتحاد پر آمادہ کریں، یہ وقت کا سب سے بڑا اجتہاد اور موجودہ حالات کی سب سے بڑی ضرورت ہے!

(۲۷/اگست ۱۹۹۹ء)

خدا ترس قیادت

بنو امیہ میں ساتویں حکمراں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہوئے، بنو امیہ کا عہد عام طور پر ظلم و جور کا عہد رہا ہے، اس دور میں حضور ﷺ کے اہل بیت پر لرزہ خیز مظالم ہوئے، نواسہ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے رفقاء اور اکثر اہل بیت کے ساتھ مظلومانہ شہید کئے گئے، مکہ پر ایسی فوج کشی کی گئی کہ بیت اللہ شریف کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، مدینہ منورہ پر ایسا حملہ ہوا کہ ہزاروں مسلمان شہید ہوئے اور بدمست حملہ آور خواتین کی بے آبروئی سے بھی باز نہ رہے، حجاج ابن یوسف جیسا شخص بنو امیہ ہی کے دور میں "عمار الحجاج" بنا، جس پر ہزاروں بے گناہ لوگوں کا خون ناحق ہے اور جس کے بارے میں حسن بصریؒ نے کہا کہ اگر تمام امتیں اپنے اپنے ظالموں کو پیش کریں اور امت محمدیہ حجاج کو تو حجاج کے ظلم کا پلڑا جھک جائے گا، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عدل و انصاف گویا بنو امیہ کے مظالم کا کفارہ ہے، جس نے خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یاد تازہ کردی، اس لئے آپ کو "عمر ثانی" بھی کہا جاتا ہے اور آپ کا ننہالی خاندان بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ناز و نعم کے پروردہ تھے اور خلافت سے پہلے ان کی نازک اندامی ضرب المثل تھی۔ جس گلی سے گزر جاتے، پوری گلی معطر ہو جاتی، ۱۰ صفر جمعہ ۹۹ھ کو سلیمان بن عبدالملک کے انتقال کے بعد زمام اقتدار آپ کو سونپی گئی، خلافت کی ذمہ داری نے آپ کی زندگی کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا، اب آپ کی زندگی کتنی سادہ تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے، جسے ابن حکم نے "سیرت عمر بن

عبدالعزیزؒ (م ۱۰۱ھ) میں نقل کیا ہے کہ عراق سے ایک خاتون آپ سے بازیابی کے لئے آئیں۔ جب آپ کے گھر پہنچیں تو معلوم ہوا کہ یہاں نہ دربان ہے نہ دربان، دریافت کیا کہ خلیفہ کے دولت خانہ پر کوئی ڈیوڑھی کا دربان بھی نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا نہیں، عام اجازت ہے۔

گھر میں ان کی ملاقات فاطمہ نامی خاتون سے ہوئی، یہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی زوجہ تھیں، جو معمولی حالت میں تنہا روئی درست کر رہی تھیں۔ خاتون نے سلام کیا، فاطمہ نے جواب دیا اور اندر آنے کی خواہش کی، آنے والی خاتون نے پورے گھر پر ایک نگاہ تجسس ڈالی اور دیکھا کہ خلیفہ کے گھر میں کوئی قابل ذکر چیز موجود نہیں ہے، یہ صورت حال ان کے لئے مایوس کن تھی، بے ساختہ زبان سے نکلا۔ "ہائے میں اس ویران و برباد گھر سے اپنے گھر کو آباد کرنے کی امید لے کر آئی ہوں!" فاطمہ نے کہا کہ: "تمہیں جیسے لوگوں کے گھران کو آباد کرنے کی کوشش میں اس گھر کا یہ حال ہوگیا ہے"۔

تھوڑی دیر گذری ہوگی کہ عمر بن عبدالعزیزؒ بھی آئے، مکان کے ایک گوشہ میں کنواں تھا، آپ نے خود اس سے پانی کھینچا اور مکان کے سامنے پڑی ہوئی مٹی پر پانی ڈالنا شروع کیا، آپ پانی بھی کھینچتے جاتے اور بیوی فاطمہ کی طرف بار بار دیکھتے بھی جاتے، نو وارد خاتون نے ان کو معمولی مزدور سمجھا اور تعجب سے فاطمہ سے کہا: اس مٹی کا کام کرنے والے مزدور سے پردہ کا خیال رکھو، میں دیکھ رہی ہوں کہ بار بار وہ تمہیں گھور رہا ہے، فاطمہ نے جواب دیا: "وہ مزدور نہیں ہیں، امیرالمؤمنین ہیں!" اس کام سے فارغ ہوکر حضرت عمرؒ گھر کے اندر آئے، کمرہ میں ایک صرف مصلیٰ بچھا ہوا تھا، جہاں آپ نماز ادا کیا کرتے تھے؟ وہیں بیٹھے اور اپنی بیوی سے نو وارد خاتون کے بارے میں دریافت فرمایا، بیوی نے تعارف کرایا، ایک تھیلی میں کچھ انگور رکھا ہوا تھا، حضرت عمرؒ اٹھے اور اس میں سے کچھ انگور ان مہمان خاتون کے لئے منتخب کئے، پھر ان کی ضروریات دریافت کی۔

خاتون نے کہا میری پانچ لڑکیاں ہیں، ہوگوں کے لئے ان سے نکاح کرنے میں

رعیت کا کوئی سامان نہیں، میں آپ کے پاس اس لئے آئی ہوں کہ ان کے گزران کا کچھ سامان کریں، یعنی ان کے لئے کچھ وظیفہ مقرر ہو جائے، حضرت عمرؓ پر ان کی بے کسی کا حال سن کر رقت طاری ہو گیا، رونے لگے، قلم دوات لیا اور والی عراق کے نام خط لکھنے لگے، تو آپ ان کی ایک ایک لڑکی کا نام پوچھتے جاتے اور ان کے لئے وظیفہ مقرر کرتے جاتے اور ضرورت مند خاتون "الحمد للہ" کہتی جاتیں، جب چار لڑکیوں کا وظیفہ مقرر ہو گیا تو خوشی میں بے ساختہ زبان سے آپ کی تعریف اور آپ کے لئے دعا نکلی، تو آپ نے ہاتھ روک لیا، فرمایا: جب تم اس ذات کی تعریف کر رہی تھیں جو لائقِ تعریف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، ہم وظیفہ مقرر کرتے رہے، اب ان چاروں لڑکیوں سے کہو کہ وہی پانچویں لڑکی پر خرچ کریں۔

خاتون فرحاں و شاداں فرمان لے کر والی عراق کے پاس پہنچیں، والی عراق نے خط دیکھا تو رونے لگا اور کہتا جاتا کہ اللہ صاحبِ مکتوب پر رحم فرمائے! عراقی خاتون نے پوچھا کہ کیا خلیفہ کا انتقال ہو گیا ہے؟ والی نے اثبات میں جواب دیا۔ خاتون کی چیخ نکل گئی اور سوچا کہ ساری محنت ضائع ہو گئی، مگر والی عراق نے تسلی دی اور کہا کہ میں اس خط کو رد نہیں کر سکتا اور مقررہ وظائف جاری ہو گئے۔

یہی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ایک دفعہ گھر میں داخل ہوئے، تو جس لڑکی سے گفتگو کرتے، وہ منہ پر ہاتھ رکھ لیتی، حضرت عمرؒ نے بیوی سے پوچھا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ بیوی نے عرض کیا: گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا، صرف دال اور پیاز تھی، وہی سب نے کھائی ہے اور منہ میں بو ہے، اس لئے یہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ رہی ہیں، آپ رونے لگے اور صاحبزادیوں سے فرمایا: کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم قسم قسم کی عمدہ غذائیں کھاؤ اور تمہارا باپ دوزخ میں داخل کیا جائے؟ یہ سن کر صاحبزادیوں کو بھی رونا آ گیا۔

خدا ترس اور خدا ناترس قیادت میں یہی فرق ہے، جہاں خدا ترسی، عند اللہ جواب دہی کا احساس اور خوفِ آخرت ہو، وہاں قیادت انسان کو ایک بوجھ محسوس ہوتی ہے، وہ اسے ایک ذمہ داری تصور کرتا ہے، نہ کہ اعزاز، وہ اس سے فکر مند رہتا ہے، نہ کہ

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے......

الیکشن ختم ہوا اور تیس تیس دن کی معرکہ آرائیاں بھی اپنے پایۂ انجام کو پہنچیں، کہیں خوشی کے شادیانے بجے، اور کہیں غم کے تازیانے لگے، کوئی جیتا اور کوئی ہارا، کسی نے فتح پائی اور کسی نے شکست کھائی۔ جیت اور ہار، فتح اور شکست زندگی کے ساتھی ہیں، دنیا کو اللہ نے بنایا ہی اس لئے ہے کہ انسان کبھی خوشی کی حلاوت اور مٹھاس چکھے اور کبھی غم و اندوہ کی تلخیاں چکھے اور یہ ضروری بھی ہے، اگر انسان ہمیشہ فتح مند اور ظفریاب ہی ہو، شکست و ہزیمت سے آشنا نہ ہو، تو مشکل ہے کہ وہ اپنے آپ کو کبر و نخوت سے بچا سکے اور اس کا اخلاقی توازن درست رہے، اور انسان جب شکست اور نامرادی سے ہمیشہ محفوظ رہتا ہے تو فرعون بن جاتا ہے، اسی طرح اگر انسان ہمیشہ نامرادی اور شکست و ناکامی ہی سے دوچار رہے تو حوصلہ و ہمت کھو دیتا ہے، دناءت اور پستی اس کی فطرت میں داخل ہو جاتی ہے اور وہ صلاحیتوں کے مفقود ہونے کی وجہ سے جذبۂ مسابقت فوت ہو جاتا ہے اور یہ کسی بھی معاشرہ کے لئے بہت ہی نقصان دہ اور ترقی کے سفر میں رکاوٹ ہے، صرف حضرات انبیاء کی خصوصیت ہے کہ فتح ہو یا شکست اور شادکامی حاصل ہو یا ناکامی، ان کے مزاج و اخلاق میں کبھی بے اعتدالی پیدا نہیں ہو سکتی، باقی کوئی بھی انسان مسلسل ایک سمت میں توازن اور اعتدال کا دامن چھوڑ دیتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ حالات بدلتے رہتے ہیں، کبھی دولت، کبھی غربت، کبھی جیت اور کبھی ہار، کبھی صحت اور کبھی بیماری، کبھی خوشی اور کبھی غم، کہ انسان کی تربیت کے لئے یہ ایسا ہی ضروری ہے جیسے انسانی جسم کو مختلف اثرات کی حامل غذاؤں کی ضرورت پڑتی ہے، وہ جتنا پانی کا حاجت مند ہے تقریباً اسی قدر

آگ کا بھی ، شبنم کی ٹھنڈک اس کے لئے جس قدر فرحت بخش ہے ، دھوپ کی تمازت اس سے کم ضروری نہیں ، خوشی پر بھی غم کا سایہ نہ پڑے اور رنج و تکلیف کے ساتھ کبھی راحت کی آمیزش نہ ہونے پائے ، اس کی جگہ صرف آخرت ہے۔

اسلام نے ہمیں یہ سبق بھی سکھایا ہے کہ جیت اور ہار کے موقع پر ہمارا کیا رویہ ہو؟ اور ہم کس طرح ان واقعات کا سامنا کریں؟ سیاسی مقابلہ آرائی میں بنیادی طور پر تین گروہ ہوتے ہیں : ایک فاتحین کا ، دوسرے مفتوحین کا ، تیسرے عوام کا ، جو لوگوں کو شکست سے دوچار کرتے ہیں ، ان میں سب سے زیادہ ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جن کی جیت ہوئی ہو ، فاتحین کے لئے رسول اللہ ﷺ کا اسوہ بنیادی طور پر تین باتیں ہیں : اول یہ کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے ، رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقع سے فتح یابی کے بعد شکرانہ کی نماز ادا فرمائی ، آج کل اسی جگہ پر مسجد فتح بنی ہوئی ہے ، جو مدینہ منورہ میں واقع ہے اور زائرین کو وہاں جانے کا موقع ملتا ہے ، فتح مکہ کے بعد بھی آپ ﷺ نے نماز شکرانہ ادا کی ہے ، اور مکہ میں داخل ہونے کے بعد حضرت ام ہانیؓ کے گھر میں ، جس کو بعض محدثین نے نماز اشراق شمار کیا ہے اور بعض نے نماز شکر ، پھر کعبہ میں داخل ہونے کے بعد کعبہ کے اندر ، اگر مکمل نماز ادا نہ کی جائے تو کم سے کم سجدۂ شکر ہی ادا کیا جائے ، رسول اللہ ﷺ کے بارے میں مروی ہے کہ جب آپ کو کوئی خوش کن بات پیش آتی تو سجدہ میں گر پڑتے اور اللہ کا شکر بجا لاتے ، کان اذا اتاہ امر یسربہ او بشر بہ خر ساجدا شکرا للہ (ترمذی ۱/۲۸۰ ، باب ماجاء فی سجدۃ الشکر) مسلمانوں کا اظہار مسرت کا طریقہ یہی ہے ، حضرت ابو بکر صدیقؓ کو جنگ یمامہ میں فتح ہوئی اور حضرت علیؓ نے خوارج کے مقابلہ میں فتح پائی تو یہی سجدۂ شکر ادا فرمایا ، (المغنی : ۱/۳۷۲) حضرت عمرؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ سے بھی سجدۂ شکر ادا کرنا ثابت ہے ، (شرح مہذب ۴/۷۰) خوشی کے اظہار کے لئے جلوس اور ریلی نکالنا ، تفاخر آمیز نعرے لگانا ، پٹاخے چھوڑنا اور غیر مسلم اقوام کی طرح ایک دوسرے پر گلال پھینکنا ، یہ سب اللہ کو ناراض کرنے اور اس کے غضب کو دعوت دینے والی باتیں ہیں۔

فاتحین کے لئے دوسرا اسوہ یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت وہ جتنا پر اعتماد اور با حوصلہ ہو ،

فاتح ہونے کے بعد اس قدر متواضع اور سراپا انکسار ہو، اس کی چال ڈھال سے، اس کے بول سے، اس کے طرز تخاطب سے، اس کی تقریر و خطاب اور تحریر و بولی سے تقویٰ اور فروتنی جھلکتی ہو، رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے موقع پر جب فاتحانہ حرم اقدس میں داخل ہوئے تو تواضع اور خشیت کا اس قدر غلبہ تھا کہ سر مبارک مسلسل جھکا ہوا تھا اور ریش اقدس بار بار اونٹ کی کوہان سے لگ جاتی تھی۔ نہ نعرۂ افتخار تھا، نہ دعوئ عز و وقار، نہ گردن اکڑی ہوئی، نہ سینے تنے ہوئے اور نہ سر اٹھے ہوئے، ایک صاحب نے جوش میں کہہ دیا کہ آج کشت و خون کا دن ہے، الیوم یوم الملحمۃ تو آپ ﷺ نے فوراً ان کی بات کاٹی اور فرمایا کہ آج رحم دلی، مہربانی اور عفو و درگذر کا دن ہے، الیوم یوم المرحمۃ، زبان مبارک پر تہلیل، حمد و تسبیح و تقدیس کے کلمات رواں تھے اور کسی عمل سے اپنی بڑائی اور دوسروں کی تحقیر کا اظہار نہیں ہوتا تھا، افسوس کہ آج بھی بہت سے غیر مسلم قائدین کے یہاں یہ کیفیت موجود ہے، یاد آتا ہے کہ ایمرجنسی کے بعد جب الیکشن ہوا، جس میں جگ جیون رام اندرا جی کی پارٹی سے الگ ہو گئے اور اندرا جی کو شکست فاش ہوئی، الیکشن کی تمام تر معرکہ آرائیوں کے باوجود لکھنؤ کی پریس کانفرنس میں ایک شخص نے اندرا گاندھی پر پھوہڑ ایک ریمارک کیا، جگ جیون رام جو اس وقت اندرا جی کے مخالفین کے سرخیل تھے لیکن انہوں نے اس ریمارک کا برا مانا اور کہا کہ اندرا جی ایک باعزت اور قابل احترام قائد ہیں اور انہوں نے ملک کی بہت کچھ خدمت کی ہے اور آج ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اگر اللہ کسی کو اچھے دن دکھائے تو وہ اپنے آپ میں نہیں رہتا، متکبرانہ نعرے اور تفاخر آمیز بیانات دیتا ہے، یہ ایک لعنت کی آندھی چلی ہے، ہم لوگوں کا یہ حال زندگی کے ہر شعبہ میں ہو گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خدا سے بے خوفی کی وجہ سے ہے، ہونا یہ چاہئے کہ جب ہم اپنی کسی مہم میں کامیاب ہوں تو اس وقت خاص کر اپنی زبان اور اپنے کلام کو متکبرانہ دعووں سے اور بیانات سے محفوظ رکھیں۔

فاتحین کے لئے رسول اللہ ﷺ کا تیسرا اسوہ شکست کھانے والوں کے ساتھ فراخ دلی اور سیر چشمی کا ہے، غزوۂ احد کے موقع پر جب دندان مبارک شہید ہو گئے اور روئے انور لہو

اسوہ موجود ہے، تکلیف دہ اوقات میں صبر و تحمل، اشتعال سے اجتناب اور توازن و اعتدال کو قائم رکھنا شکست سے دوچار ہونے والوں کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہے، اکثر ردِ عمل میں انسان انصاف کی حدود میں قائم نہیں رہ پاتا اور جس سے اختلاف ہو اس کے بارے میں سچ اور جھوٹ ہر طرح کی بات کہہ جاتا ہے، اس سے خوب اجتناب کی ضرورت ہے، ایسے لوگوں سے اللہ کی مدد روٹھ جاتی ہے اور انسان دنیا اور آخرت دونوں سے محروم ہو جاتا ہے، یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ جو کام منفی اساس پر کیا جاتا ہے اس کی عمر بہت کم ہوتی ہے، جو کام مثبت بنیادوں پر ہوتا ہے اس میں بقا اور ارتقاء ہے، اس لئے ہمیشہ اپنی مہم کو مثبت سمت میں رکھنا چاہئے، مثبت طریقہ پر جو کام کیا جائے، اس کے اوپر اٹھنے میں کچھ وقت لگتا ہے، لیکن اس کی جڑیں مستحکم ہوتی ہیں اور وہ کام دیرپا ہوتا ہے، جو تحریک منفی مقاصد کے تحت اٹھتی ہے، وہ طوفان بن کر چھا جاتی ہے، لیکن طوفان کی عمر بہت کم ہوتی ہے اور اس طرح ختم ہوتی ہے کہ اس کے نقوشِ راہ بھی زمین پر باقی نہیں رہتے، اس لئے ہمیشہ مثبت فکر کے ساتھ کام کرنا چاہئے۔

شکست ہمیں "خود احتسابی" کی دعوت دیتی ہے، کہ ہم آپ اپنا احتساب کریں اور پوری دیانت داری اور جرأت کے ساتھ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو محسوس کرتے مستقبل کا منصوبہ طے کریں، اگر واقعی دیانت کے ساتھ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم حق اور سچائی پر ہیں تو شکست سے مایوس نہ ہوں، شکست تو اللہ کے پیغمبروں اور اس کے مقبول بندوں کو بھی ہوئی ہے، بلکہ نئے عزم اور نئے حوصلوں کے ساتھ ہم دوبارہ اٹھ کھڑے ہوں اور اشتعال سے بچتے ہوئے تجدیدِ طریقہ پر دوبارہ متحرک ہو جائیں اور اگر ہم ایمانداری کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ ہم ایک غلط بات کو اپنی کوششوں کا موضوع بنا رکھا ہے تو پوری دیانت کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے رویہ میں تبدیلی لائیں، کہ غلطی کا اعتراف غلطی پر اصرار سے کہیں بہتر اور دین و دنیا دونوں کی فلاح کا ضامن ہے، جو لوگ حق و راستی پر رہتے ہوئے شکست کھائیں، ان کے لئے بھی صحیح راستہ رجوع الی اللہ ہی ہے، خدا کے سامنے جھکنا، اسی کے سامنے اپنا دردِ دل رکھنا، اس کے فیصلہ پر راضی رہنا اور

ہر بات کو من جانب اللہ تصور کرنا، یہ صاحب ایمان کا طریقہ ہے۔

عام مسلمان جو اپنے حق رائے دہی کے ذریعہ جیت اور ہار کا فیصلہ کرتے ہیں ان کی بھی ذمہ داری ہے کہ اب جب کہ معرکہ انتخاب گذر چکا ہے، اختلاف و انتشار کی فضا کو ختم کریں، اخوت اور بھائی چارگی کا ماحول پیدا کریں اور اختلاف کے باوجود اتحاد و اتفاق رکھنے کا سبق سیکھیں، عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کا اپنا امیدوار کو ووٹ دیا ہو جو کامیاب ہوا ہے تو اسے اپنی فتح سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ امیدواروں کی شکست و فتح تو ہو سکتی ہے، ووٹروں کی شکست و فتح نہیں ہو سکتی، اگر آپ نے کسی امیدوار کو دیانت داری کے ساتھ موزوں امیدوار سمجھ کر ووٹ دیا ہے تو گو وہ شکست کھا جائے، پھر بھی آپ کی فتح ہے، کیونکہ آپ جس بات کے مکلف تھے آپ نے اسے پورا کیا، اور اگر آپ کا ووٹ فتح یاب امیدوار کے حق میں گیا، لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اس کا مستحق نہیں ہے، یا آپ نے کوئی مفاد حاصل کر کے ووٹ دیا اور کوئی رشوت لے کر مستحق یا غیر مستحق شخص کے حق میں اپنے حق رائے دہی کا استعمال کیا تو امیدوار کے جیتنے کے باوجود آپ نے شکست کھائی ہے اور آپ نے پایا نہیں ہے بلکہ کھویا ہے، کیوں کہ آپ ایک ایسے گناہ کے مرتکب ہوئے اور اس کی کارگزاریوں میں بھی خدانخواستہ آپ شریک سمجھے جائیں گے۔ کتنی گہری اور سچی ہے یہ بات اور کتنی تشویش انگیز ہے اپنے ضمیر کا خون ہو" ایسے موقع کے لئے شاعر حقیقت ترجمان اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا
خواہ کیسا ہو وہ صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

(۱۵/ اکتوبر ۱۹۹۹ء)
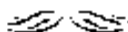
قومی یکجہتی ____ کیوں اور کس طرح؟

یوں تو تمام انسانیت کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی ہے اور بنیادی طور
پر تمام انسان ایک ہی خاندان اور کنبہ کے افراد ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانی سماج کو ایک
گلدستہ کی صورت میں وجود بخشا ہے، یہ وحدت میں کثرت کا خوبصورت مظہر ہے، انسان
کالے بھی ہیں اور گورے بھی، خوبصورت بھی ہیں اور بدصورت بھی، ذہین و ذکی اور ایسے
کہ کائنات ان کے دست تسخیر سے اپنے آپ کو بچانے سے عاجز، اور کمزور و ناتواں ایسے کہ
مریض و معذور ہوں تو پانی کا ایک گلاس بھی لینا ممکن نہیں، بعض ایسے تیز مزاج کہ آگ بھی
ان کے سامنے پانی پانی ہو جائے اور بعض ایسے نرم خو کہ برف کی ٹھنڈک بھی ان پر نثار ہو،
تہذیب و تمدن، زبان اور ذریعہ اظہار کا فرق سب سے نمایاں ہے، جو ہر سو دو سو کیلو میٹر پر
تبدیل ہوتا رہتا ہے، چوں کہ انسان عقل و خرد کی نعمت سے سرفراز ہے، اس لئے ان کے
درمیان فکر و عقیدہ کا اختلاف پایا جانا بھی فطری امر ہے، غرض انسان ایک گلدستہ ہے جس
میں مختلف رنگ و بو اور ذائقہ کے پھول جمع ہیں۔

اگر کوئی انسان چاہے کہ تمام انسان اسی کے ہم رنگ ہو جائیں، جس طرح وہ سوچتا
ہے، اسی طرح سب سوچیں، اس کی پسند سب کی پسند ہو اور اس کی ناپسند سب کی ناپسند، تو
انسانی سماج مختلف پھولوں کا گلدستہ نہ رہے گا، بلکہ سرسوں کا کھیت بن جائے گا کہ پورا
کھیت زرد اور یک رنگ نظر آئے، اسی سوچ اور مزاج کے عواقب کی وجہ سے مختلف انسانی
طبقات کے درمیان انتشار و افتراق پیدا ہوتا ہے، سماج میں زندگی گزارنے کی دوسری
صورت یہ ہے کہ سماج کے گلدستہ ہونے کی حیثیت کو تسلیم کرے، یعنی وہ وحدت میں
کثرت کو قبول کرتا ہو اور اختلاف کے باوجود اتحاد کا قائل ہو، یہی صورت سماج میں امن و

امان کے برقرار رہنے کی ضمانت ہے ہمارے ہاں اسی کا نام "قومی اتحاد" یا "قومی یکجہتی" ہے۔

دنیا کا کوئی بھی خطہ ہو، اس کے لئے قومی یکجہتی انتہائی اہم ضرورت ہے، لیکن جو ملک جس قدر کثیر قومی اکائیوں پر مشتمل ہو قومی اتحاد و یکجہتی اس کے لئے اسی قدر ضروری ہے، ہمارا ملک ہندوستان دنیا کے ان ملکوں میں ہے جن میں بے شمار مذہبی، تہذیبی اور لسانی اکائیاں پائی جاتی ہیں، اس لئے قومی یکجہتی نہ صرف اس ملک میں امن و امان اور فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے، بلکہ ملک کی سلامتی اور اس کا بقا بھی اس سے متعلق ہے، اس لئے ہمیشہ محب وطن اور مخلص رہنماؤں نے قومی یکجہتی اور اتحاد پر زور دیا ہے۔ کل ہی ۱۹/ نومبر کی تاریخ گزری ہے، ہمارے ملک میں اس دن کو "قومی یکجہتی" کے دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے۔

یکجہتی اس طرح ممکن نہیں کہ تمام انسانیت ہم رنگ ہو جائے، ان میں فکر و نظر، تہذیب و تمدن اور زبان و بیان کا کوئی فرق باقی نہ رہے، ایسی یکجہتی تو شاید قبرستان کے شہر خموشاں کے سوا کسی زندہ انسانی آبادی کے درمیان ممکن نہ ہو، یکجہتی "جیو اور جینے دو" کے اصول پر ہی پیدا ہو سکتی ہے، اسلام جس کی تمام تعلیمات و احکام کا بنیادی مقصد ہی انسانیت کو امن و سلامتی سے ہمکنار کرنا ہے، اس نے قومی یکجہتی کے لئے ایک پورا نظام قانون عطا کیا ہے اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی زندگی میں اس کو برت کر دکھایا ہے۔

اسلام نے مخلوط سماج میں زندگی گزارنے کا جو تصور دیا اس کا پہلا اصول "اجتماع باہم" ہے، یعنی مختلف لوگوں کو اپنے اپنے مذہب اور تہذیب کے ساتھ زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، اسی لئے قرآن مجید نے فرمایا کہ دین کے معاملہ میں اکراہ اور دباؤ کی گنجائش نہیں، گو مذہب حق "اسلام" ہی ہے اور اللہ کے نزدیک یہی دین مقبول ہے، لیکن دنیا میں کسی کو کسی مذہب کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا: "لا اکراہ فی الدین" (البقرہ: ۲۵۶) جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو ابتداء ہی آپ ﷺ نے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان باضابطہ تحریری معاہدہ کرایا اور نام بنام مدینہ کے تمام قبائل کا اس میں ذکر فرمایا، اس دستاویز میں ایک فقرہ اس طرح ہے: "یہود مسلمانوں کے ساتھ ایک

مسلمان جبراً زبان کی تبدیلی کے فلسفہ پر یقین رکھتے، تو یقیناً آج اس خطہ کی زبان عربی ہوتی، لیکن آج تک اس خطہ کی زبان فارسی ہے، یہی بات وسط ایشیائی علاقوں اور ہندوستان کے مغرب کے علاقوں کے بارے میں بھی صحیح ہے۔

دوسرا اہم اصول جس کو اسلام نے سماجی اور سیاسی نظام میں برتا ہے، وہ ''مساوات و برابری'' کا اصول ہے، قرآن نے صرف تقویٰ کو فضیلت کا معیار قرار دیا ہے، ''ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم'' (الحجرات: ۱۳) نسل و نسب، رنگ اور زبان فضیلت و شرافت کا معیار نہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر فضیلت نہیں۔ یہ تصور ذات پات کی بنیاد پر تفریق کی نفی کرتا ہے اور تفریق کی یہی آگ ہے جس نے ہزاروں سال سے ہمارے ملک میں انسانیت کو جھلسا رکھا ہے، اسلام میں خلافت کا تصور سیاسی اعتبار سے تمام انسانوں کے مساوی ہونے پر روشن دلیل ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی ناک کٹا حبشی غلام بھی تم پر امیر بنا دیا جائے تو اس کی بھی پیروی کرو، معلوم ہوا کہ سماج کا ایک معمولی سے معمولی سطح کا آدمی بھی صلاحیت کے ذریعہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ حاصل کر سکتا ہے، اسلام کے امتیازی اوصاف میں سے یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں ہر شخص برابر ہے، اس میں دولت مند اور غریب، اونچی ذات، نیچی ذات، حکمراں اور محکوم کا فرق نہیں، جس طرح رکشہ چلانے والے مزدور کو عدالت میں جواب دہی کرنی ہے، ٹھیک اسی طرح ایک سربراہ ملک کو بھی ایوانِ عدل میں اپنے آپ کو ایک معمولی شخص کی حیثیت سے پیش کرنا ہے، مساوات و برابری کے اس تصور اور عمل کے بغیر مختلف قومی اکائیوں کا ایک دوسرے پر اعتماد کرنا، اس اعتماد کا باقی رہنا اور حقیقی معنوں میں قومی اتحاد کا وجود میں آنا، ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف رائے کا پایا جانا ایسا ہی قدرتی ہے جیسے ستاروں میں سورج کا وجود، اس اختلاف کے باوجود اتحاد کو باقی رکھنے کی صورت اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ ہم لوگوں کو اختلاف رائے کرنے کا، اپنی رائے کے اظہار کا اور احتجاج کا حق دیں،

احتجاج و اختلاف کا جائز راستہ کھلا رکھا جائے تب ہی اس کے ناجائز اور غیر قانونی راستے بند ہو سکتے ہیں۔ اسلام نے سماجی زندگی میں باہم مل جل کر رہنے کے جو اصول مقرر کئے ہیں ان میں ایک اہم حق اظہار رائے اور تنقید و احتجاج کا حق ہے، پیغمبر اسلام ﷺ کی چشم پوشی کا حال یہ تھا کہ خود آپ ﷺ کے رفقاء انتظامی امور میں بعض اوقات آپ ﷺ سے اختلاف رائے کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ اس کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے، قرآن کی نگاہ میں "منکر" پر ٹوکنا ہر انسان کا فطری حق ہے، جس کو "نہی عن المنکر" سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ گویا شرافت کی حدوں میں رہتے ہوئے تنقید و احتجاج کے حق کا اعتراف و اعلان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر قومی یکجہتی پیدا کرنی ہے تو اس کے لئے انہیں اصولوں کو اختیار کرنا ہوگا کہ ہر طبقہ اپنی طرح دوسروں کے لئے بھی اس حق کو تسلیم کرے کہ اسے اپنے مذہب، اپنی تہذیب، اپنی زبان اور اپنے سماجی تشخصات کے ساتھ جینے کا حق حاصل ہے، ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش نہ کرے کہ اس سے گروہ واریت میں اضافہ ہوگا اور فاصلے بڑھتے جائیں گے، ہر قوم کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جائے، ذات پات، مذہب اور علاقہ کی بنیاد پر تفریق نہ برتی جائے، اگر ایسا نہ کیا گیا تو بجا طور پر کچھ لوگ احساس محرومی میں مبتلا ہوں گے اور جب ایک طبقہ دوسرے طبقہ کے بارے میں یہ احساس رکھتا ہو کہ اس نے اس کے حقوق کو غصب کر رکھا ہے تو یہ احساس یقیناً حقیقی اتحاد میں رکاوٹ بنے گا، قومی یکجہتی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر طبقہ بلکہ ہر شخص کو جائز تنقید کا موقع دیا جائے، جہاں جائز تنقید کا راستہ بند کیا جاتا ہے، وہاں تخریب کی راہیں کھلتی ہیں اور قومی اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

موجودہ حالات میں ان لوگوں کو جو حقیقی معنوں میں محب وطن ہیں، یہ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ہندوتوا، برہمن واد اور طاقت کے ذریعہ اختلاف کو کچلنے کا انداز فکر قومی یکجہتی کے لئے زہر ہلاہل ہے، قومی یکجہتی نفرت کا بیج پھینک کر حاصل نہیں کی جا سکتی، اس کے لئے محبت اور پیار کے پھول برسانے ہوں گے۔

(۱۸/نومبر ۱۹۹۸ء)

کہتے ہیں مساوات اسی کو تو ستم ہے!

روزنامہ "منصف" (۲۳/جولائی) "یو-این-آئی" کے واسطہ سے ایک خبر شائع ہوئی ہے، اس خبر کے مطابق "اتر پردیش میں الٰہ آباد کے ایک ایڈیشنل ضلع جج نے ہریجن (درج فہرست طبقہ) سے تعلق رکھنے والے ایک جج سے جائزہ حاصل کرنے کے بعد اپنے اجلاس کی گنگا کے پانی سے دھلائی کی"۔ یہ ایک اہم خبر ہے، جس سے ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی پائی جانے والی ذہنی پستی اور تنگ نظری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، دل میں چھپنے اور ضمیر کو زخمی کرنے والی اس اہم خبر کو ذرائع ابلاغ نے ذرا بھی اہمیت نہیں دی، اور یہ ایک آئی گئی بات ہوگئی، ملکی اور قومی اخبارات نے اس کو اپنے اداریہ کا موضوع بنایا، نہ اخبارات کی شہ سرخیوں میں اس نے جگہ پایا اور نہ قومی سطح کے سیاسی قائدین نے اس پر اظہار خیال کی ضرورت محسوس کی، معلوم ہے یہ اتفاقی واقعہ نہیں ہے بلکہ دانستہ ہے، کیوں کہ یہ ذرائع ابلاغ مسلمانوں کے بارے میں اس قدر "چوکس" اور "حاضر دماغ" ہیں کہ اگر معمولی سی بھی کوئی ایسی خبر آجائے جس سے مسلم سماج کی تصویر بگاڑی جا سکتی ہو تو وہ میڈیا کے لئے دلچسپ موضوع بحث بن جاتا ہے، انگریزی اور ہندی اخبارات جلی عنوان اور شہ سرخیوں کے ساتھ ایسی خبروں کو شائع کرتے ہیں اور مرچ مصالحہ ڈال کر فرقہ پرست طبقہ کے لئے اس کو لذیذ اور ذائقہ دار بناتے ہیں، اور واقعہ کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ گویا ہر مسلمان خاندان اس میں ملوث ہے، حقیقت یہ ہے کہ رائی کو پہاڑ بنانے اور پہاڑ کو رائی میں بدلنے کی مثال کوئی شخص دیکھنا چاہے تو صحافت کی "انوکھی دنیا" میں دیکھ سکتا ہے!

کسی ملک کی ترقی یہ نہیں ہے کہ وہ کتنے طاقتور ہتھیار رکھتا ہے اور انسان کو زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد تباہ و برباد کرنے کی کیسی صلاحیت سے مالا مال ہے کہ جارحیت خونریزی و تباہ کاری کی قوت تو درندوں میں انسان سے زیادہ ہے، اگر یہ قابل توصیف بات ہوتی تو

زلزلہ و طوفان کی تحسین و ستائش کرتے اور شیر اور بھیڑیے کو خیر مقدم کرتے، بلکہ قوم کی اصل ترقی انسانی اقدار کے اعتبار سے اس کی بلندی و ارتقاء میں ہے، وہ سماج قابلِ تعریف ہے، جو انسانی ضمیر رکھتا ہو، جو محبت سے بھرپور دل رکھتا ہو، جو انسان کے سکھ کو سکھ اور دُکھ کو دُکھ سمجھتا ہو، جو ہر انسان کو اپنے کنبہ کا ایک حصہ سمجھتا ہو، جو قدر و منزلت اور نجابت و شرافت کو رنگ و نسل میں، خاندان و قبیلہ میں، زبان و بیان میں اور جغرافیائی و علاقائی حد بندیوں میں تلاش نہ کرتا ہو، بلکہ کردار و اخلاق کی عظمت پر یقین رکھتا ہو، جو اپنے جیسے انسانوں کے لئے عناد و حقارت کا شعلہ نہ ہو بلکہ محبت و پیار کی شبنم ہو، جو سموم نفرت نہ پھیلاتا ہو، بلکہ محبت کی بادِ نسیم بن کر انسانیت کو عطر بار کرتا ہو، اگر کوئی سماج آدمیت ہی سے خالی ہو جائے، وہ خون اور خون میں فرق کرنے لگے، تو وہ سب کچھ ہو سکتا ہے، ”مہذب انسانی سماج“ ہونے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

یوں تو دنیا میں مختلف قومیں گزری ہیں، جو انسان کی طبقاتی تقسیم پر یقین رکھتی تھیں، ہٹلر کی ”نازی تحریک“ کو ابھی ایک صدی بھی نہیں گزری جو پیدائشی طور پر کچھ لوگوں کی برتری اور حاکمیت کے استحقاق پر مبنی تھی اور اس نے دنیا میں جو ظلم و فساد برپا کیا، وہ آج بھی ایک ضرب المثل ہے، اس قسم کے تصورات اسلام سے پہلے عربوں، ایرانیوں اور یونانیوں کے یہاں بھی پائے جاتے تھے، لیکن کسی مذہبی اور قومی تعصب کے بغیر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انسانیت کی طبقاتی تقسیم کی جڑیں یہودی اور ہندو قوم میں جتنی گہری ہیں، شاید ہی کہیں انسانوں اور انسانوں کے درمیان تفریق و امتیاز کا اتنا گہرا عقیدہ پایا جاتا ہو، یہودیوں کے یہاں حکومت و اقتدار بنی اسرائیل کا پیدائشی حق ہے، ان کے عقیدہ کے مطابق وہ خدا کی نگاہ میں معزز و محترم ہیں اور خدا کے کنبہ کا درجہ رکھتے ہیں اور باقی پوری انسانیت ان کی نسبت سے کمتر درجہ کی حامل ہے، جن لوگوں نے بائبل کے عہد عتیق اور تالمود کا مطالعہ کیا ہو، ان پر یقیناً یہ حقیقت کھلی کتاب کی طرح ظاہر ہے۔

ہندو مذہب کو انسان کی طبقاتی تقسیم کے باب میں یہودیت پر بھی سبقت حاصل ہے، ہندو مذہب کے مطابق انسان پیدائشی طور پر چار گروہوں میں منقسم ہے: برہمن،

چھتری، ویش اور شودر۔ برہما سے مراد خدا کی ذات ہے یعنی کہ برہمن کا تعلق ہی اس طبقہ کی خدا سے قربت کو ظاہر کرتا ہے۔ برہمن بنیادی طور پر خدائی نمائندہ ہوتے ہیں۔ "وید" کی تعلیم حاصل کرنا اور نذر و نیاز کا لینا صرف برہمن کا حق ہے۔ برہمن پیدائشی طور پر مخلوق میں اعلیٰ درجہ کا حامل ہے، جو کچھ اس دنیا میں ہے اصل میں برہمن کا ہے۔ جن جرائم پر دوسرے لوگ سزائے موت کے مستحق ہیں، برہمن کا اس جرم میں سر مونڈ دیا جاتا ہے۔ دس سال کا برہمن سو سال کے چھتری کے لئے بھی باپ کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ ہر طبقہ کی عورت سے شادی کر سکتا ہے، کسی دوسرے طبقہ کا آدمی برہمن عورت سے نکاح نہیں کر سکتا، تاہم اگر برہمن کسی شودر عورت سے نکاح کرتا ہے تو گویا اپنے آپ کو نرک (جہنم) کا مستحق بناتا ہے۔ برہمن خواہ کتنا بھی برا عمل کرے وہ تعظیم و احترام کا مستحق ہے۔ چھتری کا کام دان دینا، وید پڑھنا، جنگ کرنا اور حفاظت و سیاست کا کام انجام دینا ہے۔ ویش تجارت، زراعت، مویشیوں کی پرورش کا کام کریں گے اور دان دیں گے، یہ سب گویا برہمن کی خدمت کے لئے ہیں۔

لیکن ان میں سب سے بدقسمت طبقہ "شودروں" کا ہے، یہ وید کی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے، برہمن کے ساتھ بیٹھ نہیں سکتے، ان کا سب سے اہم کام پورے اخلاص سے برہمنوں کی خدمت کرنا ہے، برہمن شودر کا مال جبر سے لے سکتا ہے، اگر وہ اپنے سے اونچی ذات پر ہاتھ اٹھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے اور غصہ میں لات مارے تو پیر کاٹ ڈالا جائے، اگر شودر نے برہمن کو گالی دی تو اس کی زبان تالو سے کھینچ لی جائے اور اگر شودر دعویٰ کرے کہ وہ برہمن کو تعلیم دے سکتا ہے تو اس کو کھولتا ہوا تیل پلایا جائے، یہاں تک کہ کتے، بلی، مینڈک، چھپکلی، کوے، الو اور شودر کے مارنے کا کفارہ برابر ہے۔

اسلام نے سب سے زیادہ وضاحت اور قوت و تاکید کے ساتھ انسانیت کو جو پیغام دیا، وہ دو بنیادی فکر و عقیدہ پر مشتمل ہے، ایک وحدت الٰہ، دوسرے وحدت انسانیت، انسانی وحدت کا تصور مساوات و برابری کی سب سے بڑی تعلیم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی عربی کو کسی عجمی اور کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، ہاں تم میں سے زیادہ قابل احترام اس کی نگاہ میں وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ پر کاربند ہو

اکرمکم عند اللہ اتقکم“ آپ ﷺ نے نسلی امتیاز کی جڑ ہی کاٹ دی اور فرمایا تم سب ایک ہی آدم کی نسل سے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں، مٹی کی فطرت میں نیچا اور آنے جانے والے کے لئے اپنے سینہ کو کشادہ رکھنا ہے، وہ امیر وغریب خوبصورت و بدصورت اور حاکم و محکوم کے ساتھ ایک معاملہ روا رکھتی ہے، اسی طرح آپ ﷺ نے ایک انسان کو دوسرے انسان کے تئیں تواضع اور تکریم کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

اسلام نے نہ مذہبی اعتبار سے تفریق و امتیاز کو روا رکھا ہے، نہ تمدنی اور سیاسی اعتبار سے، اسلام نے مذہبی تعلیم کو کسی طبقہ کے ساتھ مخصوص نہیں کیا اور نہ کسی طبقہ پر اس کا دروازہ بند کیا، بلکہ ہر مسلمان پر حصول علم کو یکساں طور سے فرض قرار دیا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم“ ( ) نماز اسلام کا رکن اعظم ہے اور نماز کی امامت مسلمانوں کی مذہبی قیادت سے عبارت ہے، رسول اللہ ﷺ ہمیشہ خود امامت فرماتے رہے، آپ ﷺ کے بعد خلفاء اور گورنر امامت کرتے تھے، لیکن اس امامت کے لئے بھی آپ ﷺ نے کسی نسل و رنگ کی قید نہیں رکھی، بلکہ فرمایا کہ جو زیادہ بہتر طور پر قرآن پڑھ سکتا ہے وہ سب سے زیادہ امامت کا مستحق ہے، پھر وہ جو احکام شریعت سے سب سے زیادہ واقف ہو، اس کے بعد وہ جو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ محتاط اور متورع ہو، پھر وہ جس کی عمر زیادہ ہو، خاندان، حسب و نسب اور پیشہ کو کہیں بنائے استحقاق نہیں بنایا گیا، تمام مسجدیں ہر مسلمان پر کھلی ہیں، پھر جو پہلے آئے وہ اگلی صف میں ہوگا اور جو بعد میں آئے وہ اسی آنے کی ترتیب سے پیچھے کی صفوں میں، اگر ایک نومسلم جماعت کو قرآن زیادہ یاد ہو وہ امام ہوگا اور ایک قدیم سید مسلمان اس کا مقتدی، جہاں اس نومسلم کے پاؤں ہوں گے وہاں سے قریب ہی اس سید زادے کی پیشانی۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایک ناک کٹا ہوا حبشی بھی تم پر امیر ہو تو اس کی بھی اطاعت کرو، معلوم ہوا کہ کوئی بھی مسلمان جس پر عام مسلمان اتفاق کرلیں، مسلمانوں کا امیر اور فرماں روا ہو سکتا ہے۔ حضرت زید بن حارثہؓ ایک غلام تھے اور عربوں میں غلام کی کوئی قیمت نہیں تھی، آپ ﷺ نے ان کو اور ان کے صاحبزادہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کو ایک ایک فوج پر امیر بنایا، جس میں اکابر قریش ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے شریک تھے، حضرت عمرؓ فرمایا

کرتے تھے کہ اگر حضرت حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ زندہ رہتے تو وہ انہی کو اپنے بعد خلیفہ مقرر کرتے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیاسی پہلو سے بھی اسلام نے کس درجہ مساوات اور برابری کا تصور دیا ہے۔ آپ ﷺ نے قانون کے اعتبار سے بھی سب کو ایک درجہ میں رکھا۔ یہ نہیں کہ ایک ہی فعل اسرائیلی کے لئے جائز ہو اور غیر اسرائیلی کے لئے ناجائز، ایک ہی جرم کی سزا عام لوگوں کے لئے قتل ہو تو برہمن کے لئے سر کا مونڈھنا! ایک عرب خاتون نے چوری کی اور آپ ﷺ نے قرآن کی ہدایت کے مطابق ان کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر فرمائی، لوگوں نے سفارشیں کیں اور خود آپ ﷺ ہی کے پروردہ محبوب مولیٰ حضرت اسامہؓ کو ترجمان بنایا، آپ ﷺ اس بات پر بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ اگر اس خاتون کی جگہ فاطمہ بنت محمد ہوتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے، پچھلی قومیں اسی طرح ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے معمولی لوگوں پر سزائیں جاری کیں اور سماج کے معزز لوگوں کو سزا سے بری کر دیا۔ غرض اسلام نے ہر سطح پر انسانی مساوات و برابری اور اخوت و بھائی چارگی کا سبق انسانیت کو پڑھایا۔

مسلمان جب اس ملک میں ابر رحمت بن کر داخل ہوئے تو اس ملک کے باشیوں کے لئے ان کے ہاتھ میں سب سے بڑا تحفہ یہی "انسانی وحدت" کا پیغام تھا، وہ ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے، رہتے سہتے اور کھاتے پیتے، نہ کوئی اعلیٰ تھا اور نہ کوئی ادنیٰ، نہ کوئی شودر تھا اور نہ کوئی برہمن، نہ خاندانی اعتبار سے کوئی بڑا تھا اور نہ چھوٹا، ان کی عبادتیں مساوات کا مظہر تھیں، وہ ایک برتن میں ایک ساتھ کھایا کرتے تھے، چھوا چھوت کا کوئی تصور نہیں تھا، جو نئے لوگ مسلمان ہوتے وہ ان کے یہاں اتنے ہی معزز ہوتے جتنے پرانے مسلمان، اس مذہبی و سماجی مساوات و برابری نے ہندوستان کے دبے کچلے لوگوں میں حوصلہ و ہمت کے چراغ روشن کئے اور رفتہ رفتہ ہندوستان میں اس طبقاتی تقسیم کے خلاف آواز اٹھنے لگی، بھکتی تحریک اور مختلف تحریکیں جو طبقاتی تقسیم اور مورتی پوجا کے خلاف ہندوستان میں اٹھیں، وہ اس ملک میں خورشید اسلام ہی کے طلوع ہونے کا اثر تھیں۔

منصف مزاج ہندو دانشوروں اور خود ملک کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، نہرو جی لکھتے ہیں: "اسلامی اخوت و مساوات نے ___ جس پر

مسلمانوں کا ایمان و عمل تھا ـــــ ہندوؤں کے ذہنوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور اس سے خاص طور پر وہ محروم لوگ زیادہ متاثر ہوئے، جن پر ہندوستانی معاشرہ نے برابری اور انسانی حقوق سے استفادہ کا دروازہ بند کر رکھا تھا"۔ (ڈسکوری آف انڈیا: ۲۲۵) یہ بات بظاہر عجیب لگتی ہے کہ ہندوستان میں کم سے کم ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے ہندو سماج کی اصلاح کی کوششیں جاری ہیں، باباۓ قوم گاندھی جی، راجہ رام موہن رائے، ڈاکٹر امبیڈکر اور کتنی ہی برگزیدہ ہندو شخصیتوں نے اس کے لئے بے شمار کوششیں کیں، آزادی کے بعد پسماندہ طبقات کے لئے تحفظات کی سہولت بھی فراہم کی گئی، لیکن آج بھی صورتِ حال "ہنوز روزِ اول" کا مصداق ہے اور ایک ایسا شخص جو انصاف کی کرسی پر متمکن ہے اور مظلوموں کو انصاف کی فراہمی جس کا فریضۂ منصبی ہے، وہ بھی اپنے ہم منصب دوسرے شخص کو محض اس لئے ذلیل و حقیر گردانتا ہے کہ وہ اس کے خیال کے مطابق نیچی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہندو قوم میں ذات پات کا مسئلہ محض ایک سماجی اور رواجی مسئلہ نہیں، بلکہ ایک اعتقادی مسئلہ ہے، طبقاتی تقسیم کا تصور ان کے عقیدہ کا جزء ہے، رسم و رواج کی اصلاح نسبتاً آسان ہے اور سماجی برائیوں کو دور کرنا کم دشوار ہے، لیکن جس تصور نے ایمان و عقیدہ کا درجہ حاصل کر لیا ہو اور جس کی جڑیں افکار و تصورات میں پیوست ہوں، ان کو اکھاڑنا آسان نہیں ہوتا، نہ اعلیٰ تعلیم اس کی اصلاح کر سکتی ہے اور نہ اونچا سے اونچا عہدہ، قلب و ضمیر اور فکر و عقیدہ میں تبدیلی کے بغیر کوئی چیز نہیں، جو اس برائی کی اصلاح کر سکے، کاش! مسلمان برادرانِ اسلام تک ایمان و عقیدہ کا یہ حقیقی اور اصولی تجزیہ پہنچا سکتے!! اور اس ملک سے محبت اور خیر خواہی رکھنے والے تعصب کا چشمہ اپنی نگاہوں سے ذرا ہٹا کر اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان کی نجات کا راستہ کہاں ہے اور جو نسخۂ کیمیا اس قومی مرض کے لئے مطلوب ہے، وہ کس کے پاس ہے!! ورنہ اگر اتنی اعلیٰ سطح پر چھوا چھوت کے اس تصور کے ساتھ پائی جانے والی دستوری جمہوریت ہی کا نام انصاف اور مساوات ہے تو بقول شخصے: کہتے ہیں مساوات اسی کو تو ستم ہے!

(۷ / اگست ۱۹۹۸ء)

بوڑھے اور ہمارا سماج

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں نشو ونما کا ایک تدریجی نظام مقرر کیا ہے کہ ہر چیز جب پیدا ہوتی ہے اور وجود میں آتی ہے تو اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ناقص اور نا تمام ہوتی ہے، چاند ایک باریک دائرہ کی صورت میں نکلتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا قالب نور کے سانچہ میں ڈھل جاتا ہے، سورج جب مشرق کی طرف اپنے رخ سے نقاب اٹھاتا ہے تو اس کی کرنیں ہلکی بھی ہوتی ہیں اور چمک بھی، بڑا سے بڑا درخت بھی جب زمین کے شکم سے باہر آتا ہے تو ایسے معمولی اور کمزور پودے کی صورت میں کہ ہوا کا معمولی جھونکا اور پانی کی ہلکی سی لہر بھی اس کے لئے موت کا پیغام بن جاتی ہے، پھر یہی ناقص و نا تمام چیزیں اپنے شباب کو پہنچتی ہیں، اس کی صلاحیتیں جوان ہوتی ہیں اور اس کی طاقت اوج کمال پہنچ جاتی ہے لیکن اس کمال کے بعد پھر انحطاط اور زوال شروع ہوتا ہے اور یہ انحطاط اسے موت اور فنا تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے، سورج رات کے پردہ میں چھپ جاتا ہے، چاند چند دنوں کے لئے افق سے غائب ہو جاتا ہے، درخت سوکھ اور مرجھا جاتے ہیں۔

قدرت نے یہی تدریجی نظام انسان کی زندگی میں بھی رکھا ہے، جب وہ ماں کے پیٹ سے اس لمبی چوڑی، ہنگامہ خیز اور پُر شور کائنات میں آتا ہے تو نہایت کمزور اور طاقت وقوت سے محروم بچہ کی صورت میں، نہ خود کھا سکتا ہے نہ پی سکتا ہے، اگر خدا نے ماں باپ کے دل میں اس کے تئیں اتھاہ محبت نہ ڈال دی ہوتی تو اس کی پرورش شاید ممکن نہ ہوتی، پھر بچے بڑھتے ہیں، جسم میں نشو ونما کا عمل جاری رہتا ہے، عقل بیدار ہوتی ہے، شعور جاگتا ہے، اور انسان جوانی کی منزل میں قدم رکھتا ہے، جو ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکتا تھا، آج اپنی تقریروں سے دلوں کو گرماتا ہے اور شعر و سخن کی بزم میں آراستہ کرتا ہے، جو اپنے پاؤں پر

کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا، آج کودتا اور دوڑتا پھرتا ہے اور طوفان سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے، کل جو ایک لقمہ اٹھا کر اپنے منہ میں رکھنے کی طاقت سے بھی محروم تھا، آج اس کی تگ و دو اور دوڑ دھوپ سے ایک پورے خاندان کا گذر بسر وابستہ ہے اور اللہ نے اس کو ان کے رزق کا ذریعہ بنایا ہے، یہ جوانی کا زمانہ طاقت کے عروج اور صلاحیتوں کے کمال کا زمانہ ہے، اس زمانہ میں آدمی کے لئے یہ سوچنا بھی دشوار ہوتا ہے کہ پھر کبھی کمزوری اس پر اپنا سایہ ڈال سکے گی، چلتے ہوئے اس کے قدم لڑکھڑائیں گے، بینائی اس کا ساتھ چھوڑ دے گی اور جسم کی ایک ایک صلاحیت دامن وفا چھوڑ کر رخصت ہو جائے گی۔ لیکن آخر ہوتا وہی ہے جس سے انسان بھاگنا چاہتا ہے، جوانی رخصت ہوتی ہے اور بڑھاپا اپنی پوری شان کے ساتھ سایہ فگن ہو جاتا ہے، اب آنکھوں پر موٹے چشمے ہیں، چہروں پر جھریاں ہیں، ہاتھوں میں عصا ہے، قدموں میں لرزہ ہے، حافظہ اور یادداشت نے بھی ساتھ چھوڑ رکھا ہے، منھ دانت سے خالی ہے اور آواز ایسی ہے کہ پاس کا آدمی بھی بات سمجھ نہیں پاتا ہے، اس منزل کے بعد قبر ہی کی منزل ہے، انسان بچپن میں بھی محتاج اور عجز و ناطاقتی کا نمونہ ہوتا ہے اور بڑھاپے میں بھی، لیکن بڑھاپے میں یقیناً مجبوری کا احساس زیادہ ستاتا ہوگا، جوانی کے ایک ایک قصے یاد آتے ہوں گے اور اشک افسوس سے داڑھی تر ہوتی ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ بڑھاپے کا زمانہ انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ قابل رحم اور لائق ترس ہوتا ہے، اسی لئے اسلام نے بوڑھوں کی خصوصی رعایت اور ان کے احترام و توقیر کا حکم دیا ہے، مغربی دنیا میں خاندانی نظام کے بکھر جانے کی وجہ سے بوڑھے اور ضعیف العمر لوگوں کے مسائل نے بڑی نازک صورت حال اختیار کر لی ہے، اسی لئے اب عالمی سطح پر اس مسئلہ کو محسوس کیا جا رہا ہے، اقوام متحدہ کی طرف سے یکم اکتوبر کو "بوڑھوں کے دن" کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، لیکن اسے کافی نہ سمجھتے ہوئے ۱۹۹۹ء کے پورے سال کو "بوڑھوں کا بین الاقوامی سال" قرار دیا گیا ہے، ایک اندازہ کے مطابق اس وقت دنیا میں بوڑھے اور ضعیف لوگوں کی تعداد چالیس کروڑ کے قریب ہے اور توقع ہے کہ ۲۰۰۰ء تک یہ تعداد ساٹھ کروڑ سے بھی تجاوز کر جائے گی، ہندوستان میں اس وقت ساٹھ سال سے زیادہ

سن رسیدہ لوگوں کی تعداد چھ کروڑ سے بھی زیادہ ہے اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ دو برس بعد یہ تعداد سات کروڑ اسّی لاکھ ہو جائے گی، بوڑھوں کی تعداد میں آزادی کے بعد سے ایک سو ستر فیصد اضافہ ہوا ہے، جس کی وجہ وسائل علاج میں بہتری بھی ہے اور خاندانی منصوبہ بندی کی وجہ سے شرح پیدائش میں کمی بھی۔

آج بوڑھے اور ضعیف العمر افراد جن مشکلات سے دوچار ہیں، وہ دراصل مغربی نظامِ معاشرت کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور ان ہی سے مشرق میں بھی یہ سماجی دشواریاں درآمد ہوئی ہیں، مشرق پر ہمیشہ سے مذہبیت کا غلبہ رہا ہے اور دنیا کا کوئی مذہب نہیں جس میں والدین اور بزرگوں کی خدمت اور ان کے احترام و توقیر کا سبق نہ پڑھایا گیا ہو، اس لئے بزرگوں کی خدمت کا جذبہ اور ان کو بوجھ کے بجائے اپنے لئے رحمتِ خداوندی تصور کرنا مشرق کے مزاج میں رہا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے خوب فرمایا ہے کہ تم لوگوں کو ضعفاء اور کمزوروں ہی کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے: ''إِنَّكُمْ تُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَائِكُمْ'' یہ بڑی اہم بات ہے، آدمی ایسے بوڑھے اور معذور لوگوں کو اس لئے تو بوجھ سمجھتا ہے کہ وہ صرف کھاتے ہیں، کماتے نہیں ہیں، ان کے پاس کھانے والے ہاتھ ہیں کمانے والے ہاتھ نہیں، آپ ﷺ نے اس تصور ہی کی جڑ کاٹ دیا اور فرمایا کہ ایسا نہیں ہے کہ تم ان کو رزق فراہم کرتے ہو، بلکہ ان کی وجہ سے اللہ تم کو رزق عطا فرماتے ہیں، گویا وہ تمہارے محسن ہیں، نہ کہ تم ان کے اور وہ تم کو کھلاتے ہیں نہ کہ تم ان کو، اگر یہ بات دل میں اتر جائے تو لوگ ایسے بوڑھے اور ضعیف لوگوں کو خدا کی بہت بڑی نعمت تصور کریں اور سراپا رحمت سمجھیں۔

مغربی سماج کی بنیاد مادیت پر ہے اور مادیت پرستی ہمیشہ خود غرضی کا محور رہی ہے، اسی لئے خود غرضی مغربی معاشرہ کا ایک اہم اور بنیادی عنصر ہے، طلاق کی کثرت ان ممالک میں کیوں ہے؟ اس لئے کہ جب میاں بیوی کا دل ایک دوسرے سے بھر گیا تو اب محبت کی ایک رمق بھی باقی نہیں رہی، زنا کی کثرت کیوں ہے؟ اسی لئے کہ مرد و عورت کا تعلق محبت کے بجائے وقتی اغراض اور ہوس پرستی ہے، سود نے کاروبار میں غصب

کیوں پایا جاتا ہے؟ اس لئے کہ سرمایہ دار کو فرزندوں کی پریشانی سے کوئی غرض نہیں، اس کو صرف اپنا بے خطر سود عزیز ہے، منشیات کی وباء کیوں عام ہے؟ اسی لئے کہ خود تو دو گھڑیوں کا سکون حاصل ہو جائے، چاہے یہ عیاشی اس کے متعلقین کے لئے کسی قدر بھی سامانِ مصیبت ثابت ہو، غرض ہر شعبۂ زندگی کی روح یہی ہے، ایسے سماج میں اگر بوڑھے گھر سے نکال دیئے جائیں، ان کو ہاسٹل میں رکھا جائے، جہاں اپنے بچوں کو دیکھنے کے لئے دل ترستا ہو اور آنکھیں ترستی ہوں اور گھڑی دو گھڑی کی ملاقات کے لئے کرسمس کا انتظار کرنا پڑتا ہو تو اس پر حیرت نہ ہونی چاہئے، مغربی تہذیب کی بد ذوقی کو مشرق کے لوگوں نے بادِ نسیم سمجھا اور ایک نعمتِ عظمیٰ کی طرح ان کا استقبال کیا، تو جو بگاڑ اس نے وہاں پیدا کیا ہے، یہاں بھی ان کا ظہور میں آنا چنداں عجیب نہیں، چنانچہ اب ہندوستان میں بھی ایسے لوگوں کے لئے ہاسٹل بنے ہیں اور خود ہمارے شہر حیدرآباد کے مضافات میں اس طرح کے ہاسٹل بن چکے ہیں۔

اسلام میں بوڑھوں کے لئے بڑی رعایت بھی ہے اور قدر و منزلت بھی، قدم قدم پر ان کے لئے احکامِ شریعت میں سہولتیں برتی گئی ہیں، نماز میں قیام یعنی کھڑا ہونا فرض ہے، کھڑی ہوئی حالت میں جھک کر رکوع کرنا اور بیٹھی ہوئی حالت میں سجدہ کرنا بھی فرض ہے۔

لیکن جو لوگ بڑھاپے اور ضعف کی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکیں، وہ بیٹھ کر بھی نماز پڑھ سکتے ہیں اور اشارہ سے بھی رکوع و سجدہ کیا جا سکتا ہے، ایسے ضعیف اور کہن رسیدہ لوگوں کے لئے گنجائش ہے کہ روزہ رکھنے کے بجائے فدیہ ادا کریں، بڑھاپے کی وجہ سے سفر کی قدرت نہ ہو تو کسی اور شخص سے حجِ بدل کرانے کی گنجائش ہے، فریضۂ جہاد ایسے شخص سے معاف ہے۔

ایسے لوگوں کی کفالت شرعاً واجب ہے، اگر ماں باپ کا معاملہ ہو تو گو ان میں کمانے اور کسبِ معاش کرنے کی صلاحیت ہو پھر بھی ان کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ بال بچوں پر ان کی ضروریات کی تکمیل ضروری ہے، دوسرے اقارب کا حکم ذرا مختلف ہے، اگر کوئی شخص بڑھاپے کی وجہ سے کسبِ معاش کی طاقت نہیں رکھتا اور وہ صاحبِ اولاد ہو تو قریب

قریبی رشتہ دار پر اس کی ضروریات پوری کرنا واجب ہے اور اگر وہ خود اس کی صلاحیت رکھتا ہے تو پھر دوسروں پر اس کی ذمہ داری نہیں۔ (دیکھئے رد المحتار ۵؍۵۵۵، ۶۳۰ وغیرہ کتب فقہ)

بڑھاپے کی نفسیات کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس عمر میں انسان چاہتا ہے کہ اس کے چھوٹے اس کے ساتھ عزت و توقیر کا معاملہ کریں، اس کو سماج میں بہتر مقام دیا جائے، آپ ﷺ نے اس کا بھی پاس و لحاظ فرمایا ہے، ایک کبر رسیدہ شخص آپ ﷺ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے، لوگوں نے جگہ دینے میں دیر کی تو آپ ﷺ نے تنبیہ کی اور فرمایا کہ جو شخص چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کی توقیر نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، لیس منا من لم یرحم صغیرنا و یوقر کبیرنا (ترمذی، باب ماجاء فی رحمۃ الصبیان) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ایک روایت میں ہے کہ جو بڑوں کا مقام نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں، (حوالہ سابق) انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، جو نوجوان کسی بوڑھے شخص کی اس کی عمر کی رعایت کرتے ہوئے تعظیم کرے گا تو جب وہ نوجوان اس عمر کو پہنچے گا تو اللہ اس کے لئے بھی ویسا ہی تعظیم کرنے والا مہیا کردیں گے۔ ما اکرم شاب شیخا لسنہ الا قیض اللہ لہ من یکرمہ عند سنہ۔

(ترمذی، باب ماجاء فی اجلال الکبیر)

بزرگوں کی تعظیم اور اکرام کے عمومی احکام تو آپ ﷺ نے دیئے ہی، مختلف خصوصی مواقع پر اس احترام کو برتنے کا بھی حکم دیا، آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ جب کئی لوگ ہوں اور ان کو اپنی بات پیش کرنی ہو تو بڑے کو گفتگو اور نمائندگی کا موقع دینا چاہئے۔ "کبر الکبیر" (مسلم ۲؍۵۵) اسی طرح اگر دو اشخاص علم قرأت اور سنت کی واقفیت کے اعتبار سے برابر ہوں تو جو ان میں عمر دراز ہو اس کو حق امامت میں اولیت حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دو رفقاء کو رخصت کرتے ہوئے اس کی نصیحت فرمائی، ولیؤمکما اکبرکما سنا (بخاری و مسلم) اسی طرح فقہاء لکھتے ہیں کہ سلام کرنے میں بھی چاہئے کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرنے میں سبقت کرے۔ (ہندیہ ۵؍۳۲۵)

ادب و احترام کا کوئی ایک ہی طریقہ متعین نہیں، بلکہ مواقع اور حالات کے لحاظ

یک ور آدمی سفر کے لئے نہیں نکلتے تھے کہ اس کے بغیر بہ سلامت واپسی کی کوئی امید ہی نہیں
ہوتی تھی، بدکاری کا حال یہ تھا کہ لوگ اس بات کو بھی درست سمجھتے تھے کہ اچھی نسل حاصل کرنے
کے لئے اپنی بیوی کو دوسرے مرد کے پاس بھیجا جائے اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک عورت سے کئی
مرد ہم آغوش ہوتے اور جب بچہ ہوتا تو قیافہ شناس سے نسب کی شناخت کرواتے، اس کو "نکاح
رہط" کہا جاتا تھا۔ (بخاری: ۲/۷۶۹) بے حیائی اور فحاشی اس درجہ پہنچی تھی کہ لوگ اپنی
باندیوں کو لکھ کر غلافِ کعبہ سے آویزاں کر دیتے تھے اور بے تکلف اپنے اشعار میں اس کا
ذکر کرتے تھے، جنگ وجدال تو گویا ان کی طبیعت ثانیہ تھی اور معمولی واقعات پر برسوں بلکہ
نسلوں معرکہ آرائی ہوتی رہتی تھی۔

ان حالات میں رسول اللہ ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور آپ نے جرم و گناہ کے اس
جنگل کو صدق وصفا اور محبت و وفا کی بستی بنا دیا، آپ ﷺ نے اس کے لئے تین طریقے اختیار
کئے۔ اول دلوں کا تزکیہ اور لوگوں کی فکر و سوچ میں انقلاب، دوسرے ان اسباب و محرکات کا
سدباب جو جرم میں معاون ہوتے ہیں، تیسرے سنگین جرائم پر سخت سزائیں، یہی طریقہ کار تھا
جس نے جرائم کے خوگر عربوں کی حالت بدلی اور انسانیت کے قاتلوں کو انسانیت کا محافظ
اور نگہبان بنا کر کھڑا کیا۔

آپ ﷺ نے سب سے پہلے اس بات کی کوشش کی کہ دلوں کی دنیا میں انقلاب لایا
جائے، دل میں خدا کا ایسا خوف بٹھایا جائے اور آخرت کی جواب دہی کا ایسا احساس پیدا
کیا جائے کہ انسان جیتے جی موت کے بعد کی زندگی کو دیکھنے لگے، آخرت سے پہلے ہی آخرت
اس کے سامنے آ جائے اور محسوس کرنے لگے کہ وہ خدا کے سامنے کھڑا ہے، یہی انقلاب تھا جس
کے نتیجے میں صحابہ معمولی معمولی گناہوں پر تڑپ اٹھتے تھے اور بے چین ہو جاتے تھے۔

کتب حدیث میں ایک صحابی حضرت ماعز اسلمیؓ اور ایک صحابیہ حضرت غامدیہؓ کا ذکر
آتا ہے، از راہ بشریت ان سے برائی کا صدور ہو گیا، ان کی غلطی کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ
کسی کی زبان نے ٹوکا، نہ کسی مدعی نے ان کے خلاف دربار نبوی ﷺ میں دعویٰ کیا، لیکن
احساس گناہ نے ان کے زندہ اور صاحب ایمان ضمیر کو ایسا تڑپایا کہ از خود دربار نبوی ﷺ میں

اس طرح آپ ﷺ اپنے رفقاء کو تعلیم دیتے کہ جب اسبابِ دنیا پر دل ریجھنے اور طبیعت مچلنے لگے تو آخرت کے سامانِ عیش کو یاد کر لیں، اس سے نفس کی حرص و طمع کا علاج ہو جائے گا۔

ایک صاحب کا مقدمہ خدمتِ اقدس ﷺ میں آیا، وہ زبان آور تھے، اس لئے فریقین کا بیان سن کر آپ ﷺ نے ایک کے حق میں فیصلہ فرمایا، پھر فرمایا کہ ممکن ہے کہ میں نے تمہاری چرب زبانی سے متاثر ہو کر تمہارے حق میں فیصلہ کر دیا ہو، حالانکہ فی الحقیقت وہ زمین تمہاری نہ ہو، تو اگر ایسا ہو تو یہ تمہارے حق میں زمین کا نہیں بلکہ جہنم کا ٹکڑا ہے۔ آپ ﷺ کی یہ بات سن کر وہ صاحب زمین سے دستبردار ہو گئے اور دوسرے فریق نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا، آخر آپ ﷺ نے وہ زمین دونوں میں نصف نصف تقسیم فرمائی۔ اسی لئے جب تک دل کی دنیا نہ بدلے اور بنیادی فکر و سوچ میں انقلاب نہ آئے، سماج کو جرم سے پاک کرنا ممکن نہیں۔

دوسرے آپ ﷺ نے ان راستوں کو بند کیا جو آدمی کو گناہ تک لے جاتے ہیں، مثلاً اسلام میں زنا حرام ہے، تو شریعت نے اس جرم کو روکنے کے لئے مختلف تدبیریں بھی اختیار کیں: پردہ کا نظام قائم کیا گیا، غیر محرم خواتین کے ساتھ تنہائی کو منع فرمایا گیا، مخلوط تعلیم اور عریانیت کی ممانعت کی گئی، شراب اور نشہ جو اخلاقی برائیوں کا سب سے بڑا محرک ہے، اس کو سنگین جرم قرار دیا گیا، نکاح کی حوصلہ افزائی کی گئی، نکاح میں تاخیر اور تجرد کی زندگی کو آپ ﷺ نے ناپسند فرمایا، بخشش مت لیجئے اور جہیز کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی، غرض وہ تمام راہیں بند کر دی گئیں جو انسان کو اس گناہ تک لے جاتی ہوں، اس کے ساتھ جب زنا کو حرام قرار دیا گیا تو نہ جرم سے بچنا لوگوں کو دشوار ہوا اور نہ جرم سے روکنے کے لئے کوئی مہم جوئی کرنی پڑی۔

یہی حال شراب کا ہے، آپ ﷺ نے نہ صرف شراب پینے کو حرام قرار دیا بلکہ شراب کی خرید و فروخت اور اس کی صنعت، نیز اس کے حمل و نقل کو بھی، اس طرح شراب کا حاصل کرنا ہی کارِ دشوار ہو گیا، اگر ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے تو جو لوگ منشیات کا رجحان رکھتے ہیں، پہلے مجبوراً منشیات سے باز آئیں گے اور پھر یہی ان کی عادت ہو جائے گی۔

جرم کو روکنے کے لئے تیسرا طریقہ قانون کا ہے، بعض انسانی طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ

آپ کتنی ہی محبت کی زبان استعمال کرلیں اور صبح و ہمدردی کے ساتھ دل کے بند دروازوں پر دستک دیں، لیکن قانون کی تلوار کے سوا کوئی چیز ان کو سرخمیدہ نہیں کرپاتی، ایسے لوگوں کے تحت قانون بھی ایک ضرورت ہے، اس وقت ایک رجحان یہ پیدا ہو گیا ہے کہ مجرم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نرم دلی اور عفو و درگزر سے کام لیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو ثبوت جرم کے قانون کو سخت اور سزا کے قانون کو ہلکا بنایا جائے، گویا مجرم کو دوہرا فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے، اسلام کا تصورِ جرم و سزا یہ ہے کہ ثبوت جرم کے لئے تو مناسب شواہد فراہم ہونا ضروری ہے تاکہ بے قصور قصوروار نہ ٹھہرے اور کسی کو جرم بے گناہی کی سزا بھگتنی نہ پڑے، لیکن جب جرم ثابت ہوجائے تو سزا عبرتناک ہو اور سزا کے نفاذ میں نرم روی اختیار نہ کی جائے۔ ہاں یہ کہ جرم کا تعلق کسی خاص انسان کے حق سے ہو اور وہ خود مجرم کو خوشی سے معاف کردے، سزاؤں کے سخت ہونے کا فائدہ ماحول کی تطہیر اور عبرت انگیزی ہے، سزائیں اگر سخت نہ ہوں تو اس سے مجرم کو شہ ملتی ہے اور جرائم پسند طبیعتوں کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ آج کل بڑے بڑے جرائم پر چند ہزار کے جرمانے عائد کئے جاتے ہیں، چند ماہ یا سال سزائے قید ہوتی ہے، یہ جرائم کو روکنے اور مجرمین کے حوصلے پست کرنے کے لئے بالکل ناکافی اور غیر تشفی بخش ہیں، یہی وجہ ہے کہ مجرم سزا پانے کے بعد جرم سے بچنے کے بجائے اور بھی مہارت کے ساتھ جرم کا ارتکاب کرتا ہے، پولیس اسٹیشنوں میں ایک ایک مجرم پر بیسیوں مقدمات دائر ہوتے ہیں اور وہ قید خانہ اور جیل کو "مہمان خانہ" باور کرنے لگتا ہے۔

سزاؤں کے نفاذ میں نرمی کی وجہ سے ردعمل کے طور پر پیدا ہونے والے جرائم کا سد باب ہوتا ہے، کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی ہوئی ہو اور مجرم کو کما حقہ سزا مل جائے تو مظلوم کی تشفی ہوجاتی ہے اور آتش انتقام بجھ جاتی ہے، اگر اسے یہ احساس ہو کہ ان کے مجرم کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا اور اسے اس کے جرم کی نسبت سے سزا نہیں مل پائی تو اندر ہی اندر شعلہ انتقام بھڑکتا اور موقع کی تاک میں رہتا ہے اور جب بھی کوئی موقع ہاتھ آجائے وہ جوابی وار کئے بغیر نہیں رہتا، اس طرح سماج میں جرائم کو پنپنے کا موقع ملتا ہے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا خیال جڑ پکڑتا ہے، اسی لئے قرآن مجید نے کہا ہے کہ قصاص یعنی مقتول کے بدلہ قاتل کو قتل کرنے میں

تمہارے لئے زندگی در حیات مضمر ہے" ولکم فی القصاص حیوة" (البقرہ:۱۷۹)

یہ حقیقت تجربات کی کسوٹی پر پرکھی ہوئی اور ہر امر واقعہ سے بھی زیادہ روشن ہے کہ اگر انسان کو جرائم سے پاک محفوظ اور پرسکون سماج مطلوب ہو تو اسے ماضی کی طرف لوٹنا ہوگا اور اسی سماج اور سوسائٹی کے طریقہ اصلاح کو اپنے لئے اسوہ و نمونہ بنانا پڑے گا، جسے صحراء عرب کے بدوؤں میں پیغمبر اسلام محمد عربی ﷺ نے اختیار کیا تھا، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ لوگوں کے مردہ ضمیر کو زندہ کرنے کی ادنیٰ سی کوشش بھی نہیں کی جا رہی ہے، حکومت کی انتظامی مشنری جس کی تربیت اور ذہن سازی سرکار کا فریضہ ہے وہ سر تا پا رشوت میں ڈوبی ہوئی ہے اور ظلم و جور اور بد اخلاقی کا اعلیٰ نمونہ ہے، جرائم کے اسباب و عوامل پر تو کیا روک لگے گی، ایسے راستے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جا رہے ہیں جو نوجوانوں کو جرم پر اکساتے ہیں اور تشدد کے طریقے بتاتے ہیں، بد اخلاقی سکھانے اور مجرم بنانے کے لئے فلمیں ہی کیا کم تھیں کہ ٹیلی ویژن کا عذاب ہر مکان میں بھی گھر گھر داخل ہوا، پھر ویڈیو کی لعنت آئی جو نوجوانوں کو تیزی کے ساتھ کونے کونے میں پائے جانے والے مجرمانہ طریقے اور جنسی جذبات کے تحت نئے انداز سے روشناس کرا رہی ہے، سنا ہے کہ انٹرنیٹ کا جادو اور اس کا مقصد ان تمام فتنوں سے بھی بڑا ہے، پرنٹ میڈیا بھی جو اخلاق سوز مواد پیش کر رہا ہے وہ اس کے علاوہ ہے، اب تو جرائم کی تعلیم کی کتابیں بھی چھپ رہی ہیں اور منہ مانگے دام بک رہی ہیں تاکہ لوگ جرائم و بد اخلاقی کے تحت نئے انداز سیکھیں اور حسب توفیق اس کا تجربہ کریں۔

تو کیا جرائم کی اتنی اشاعت و تشہیر اور سہل الاثر تعلیم و ترغیب کے لئے مہیا اسباب و وسائل کی فراہمی کے باوجود پر امن اور جرم سے محفوظ سماج کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے اور کیا رات کی تیرہ و تاریکی میں سورج کی کرنیں پھوٹ سکتی ہیں؟!

(۲۱/اگست ۱۹۹۸ء)

گناہ جو کبھی معاف نہیں ہوگا

اسلام کی نگاہ میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک اور کفر ہے۔ اس کی سزا ہمیشہ کے لئے دوزخ ہے۔ جو شخص کفر کی حالت میں دنیا سے چلا جائے، اس پر جنت کے دروازے بند ہیں، اور ہمیشہ کے لئے دوزخ کی آتشیں آغوش اس کی رفیق رہے گی۔ کفر کے بعد ایک ہی عمل ہے جس کے بارے میں قرار دیا گیا کہ اس کا مرتکب ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا، اس پر اللہ کا غضب ہوتا رہے گا، اور اللہ کی لعنت برستی رہے گی۔ کتنا لرزا دینے اور تڑپا دینے والا ہے یہ ارشاد ربانی:

”وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا“ (النساء ۹۳)

جو جان بوجھ کر کسی مسلمان کو قتل کرے اس کا بدلہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہو، اور اللہ نے اس کے لئے بھیانک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

کتنی لرزہ خیز وعید اور کیسی دہلا دینے والی ہے یہ آیت! ــــــ لیکن اس شخص کے لئے جس کے دل میں خوف خدا وندی کا کوئی گوشہ موجود ہو، جس کی آنکھ کبھی کبھی اللہ کے خوف سے نم ہو جاتی ہو، جس کا دل آخرت کے تصور سے ہولناکی و دہشت کی لرزش سے آشنا ہو، جو آخرت کے وعدوں پر یقین رکھتا ہو، جسے جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی ہولناکیوں پر ایمان ہو، اور جس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہو، جن سینوں میں دل کے بجائے پتھر کی سل رکھی ہوئی ہو اور جن قلوب میں محبت کی شمع جلنے کی بجائے نفرت اور ظلم و جور کی بھٹیاں سلگتی ہوں ان کے بارے میں کیوں کر سوچا جا سکتا ہے کہ خالق کائنات کا یہ ارشاد

کبھی ان کو تڑپا سکے گا؟ خدا اور رسول ﷺ کی بات بھی ان کے دلوں پر دستک دے سکے گی؟؟

آہ! کس قلم سے لکھا جائے اور کس زبان سے بولا جائے کہ ہمارے شہر میں ابھی چند دنوں قبل ایک مسلمان کا بے دردانہ قتل ہوا ہے، کن کے ہاتھوں؟ کیا کسی غیر مسلم کے ہاتھ؟ کیا کسی دشمن اسلام کے ذریعہ؟؟ نہیں، غیرت کے کانوں سے سنئے، کہ ایک کلمہ گو نے دوسرے کلمہ گو کو ناحق قتل کیا ہے، ایک مسلمان کی تشنہ تلوار نے ایک مسلمان ہی کے لہو سے اپنی پیاس بجھائی ہے، جس نے رسول خدا ﷺ کا غضب خرید لیا ہے، اپنے گلے کو لعنت خداوندی کے طوق سے آراستہ کیا ہے، اور ابدی دوزخ حاصل کی ہے، اس بے حسی پر آنکھیں جس قدر آنسو بہائیں، دل جتنا بھی تڑپے اور روئے کم ہے۔ جانے یہ اس امت کا حال ہے جس کو آخر آخر دم تک اس کے نبی ﷺ نے مسلمان کے خون کی حرمت بتائی تھی، اور ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو سے ہاتھ دراز کرنے سے منع فرمایا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف فرمادیں گے، سوائے اس کے کہ کوئی شخص شرک کی حالت میں مرے یا کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کردے۔ (ابوداؤد ۴۲۷۰) حضرت عبادہ بن صامت ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی مومن کو قتل کیا اللہ تعالیٰ نہ اس کی کوئی فرض نماز قبول فرمائیں گے اور نہ نفل۔ لم يقبل الله منه صرفا ولا عدلا۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر ۴۲۷۰) اور یہ بات ہو کہ مومن کا قتل اللہ کے نزدیک دنیا کے ختم ہوجانے سے بڑھ کر ہے۔ قتل المؤمن اعظم عند الله من زوال الدنيا (نسائی حدیث ۳۹۹۰) حضرت ابوسعید خدری ؓ اور ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمام اہل زمین اور اہل آسمان بھی ایک مسلمان کی موت میں شریک ہوں، تو اللہ ان سب کو جہنم میں اوندھے منہ ڈال دے گا۔ (ترمذی حدیث نمبر ۱۳۹۸) اس سے اندازہ کیجئے کہ مومن کے خون کی کیا حرمت اور عظمت ہے؟ اور کسی مسلمان کا جان لینا کیسی لعنت اور غضب الٰہی کو دعوت دینا ہے؟ اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ مومن برابر دین کے معاملہ میں وسعت و گنجائش میں رہتا ہے، جب تک کہ کسی خون حرام کا مرتکب نہ ہو۔ (بخاری، حدیث نمبر ۶۸۶۲)

جیسے قتل کرنا گناہ ہے، اسی طرح قتل میں تعاون بھی گناہ ہے، بلکہ اگر کسی شخص نے دوسرے کو قتل پر اکسایا ہو، یا دوسرے کو قتل پر استعمال کیا ہو تو اس کا گناہ اصل قاتل سے بھی بڑھ کر ہے، ایک بار آپ ﷺ سے قاتل اور قتل کا حکم دینے والے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جہنم کے ستر حصے کئے جائیں گے جس میں انہتر (۶۹) حصہ قتل کا حکم دینے والے کے لئے ہوگا اور ایک حصہ خود اس قاتل کے لئے، اور یہ ایک حصہ بھی اس کے لئے بہت کافی ہوگا۔ وللقاتل جزء و حسبه

[مسند احمد، حدیث نمبر ۲۳۱۵۲، عن مرثد بن عبداللہ]

نہ صرف یہ کہ قتل پر اکسانا اور ابھارنا بہت بڑا گناہ ہے، بلکہ مقتول کو بچانے کی کوشش نہ کرنا اور پہلوتہی سے کام لینا بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق بنا دیتا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جہاں کسی شخص کا ظلماً قتل ہو، وہاں تم کھڑے نہ ہو، وہاں موجود رہنے والوں پر بھی اللہ کی لعنت ہوتی ہے، کہ انہوں نے اسے بچایا کیوں نہیں؟ اور جہاں کسی شخص کو ظلماً زدوکوب کیا جا رہا ہو وہاں بھی نہ ٹھہرو، کیوں کہ حاضرین پر بھی اللہ کی لعنت ہوگی، کہ انہوں نے مدافعت کیوں نہیں کی۔

(طبرانی فی الکبیر، حدیث نمبر ۱۱۶۷۵)

اصل یہ ہے کہ کسی شخص کو قتل کرنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کی زندگی میں انسانی خون اور انسانی زندگی کا احترام نہیں، اور یہ بہت ہی خطرناک بات ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ " ایک نفس انسانی کا قتل پوری انسانیت کو قتل کرنے اور ایک انسان کو بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف ہے" " مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا " (المائدہ: ۳۲)

اس جرم کے شدید ہونے کی وجہ ظاہر ہے، زندگی اللہ کی امانت ہے، جان دینا اور جان لینا اللہ ہی کا حق ہے، قاتل گویا اللہ کا حق اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے، اس سے بڑھ کر تعدی اور کیا ہوگی؟ پھر خود مقتول کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی ہے، قتل کی تکلیف کو جس سے

بڑھ کر کسی اور تکلیف کا تصور نہیں کیا جا سکتا، پھر قاتل اسے ایسی نعمت سے محروم کرتا ہے، جس کی واپسی ممکن نہیں، اور جس کا بدل ناقابلِ حصول ہے، یہ تو خود قاتل کا معاملہ ہے، پھر غور کیجئے کہ ہر انسان کے ساتھ کتنے ہی حقوق متعلق ہیں، معصوم بچوں اور بچیوں کی تربیت اس کے ذمہ تھی، جوان بیٹوں کی شادی کا وہی ذمہ دار تھا، بوڑھے ماں باپ کی کفالت اسی کے سر تھی، بیوی کا سہاگ اس کے دم سے قائم تھا، خاندان کی کتنی ہی آرزوئیں اور تمنائیں اس سے متعلق تھیں، اور سماج کی کتنی ہی امیدیں اور توقعات اس سے وابستہ تھیں، یہ ظاہر میں ایک جان کا قتل ہے، لیکن درحقیقت وہ کتنی ہی تمناؤں، حسرتوں، امیدوں اور آرزوؤں کا قاتل ہے، اس نے ایک بے قصور عورت کو بیوہ کیا، معصوم بچوں کو یتیم اور بے سہارا بنایا، بوڑھے ماں باپ سے اس کا عصائے پیری چھینتا ہے اور چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کی امیدوں کے محل کو خاکستر کر کے رکھ دیا ہے، اس لئے یقیناً اس نے ایک شخص کا نہیں بلکہ ایک خاندان اور ایک کنبہ کا اور انسانیت کا قتل کیا ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انتقام کا قانون رکھا کہ یا تو خود قاتل کیفرِ کردار تک پہونچا دیا جائے (البقرہ: ۱۷۸) اگر مقتول کے اولیاء رضامند ہو جائیں تو ان کو دیت ادا کی جائے، جو سو اونٹ یا اس کی قیمت ہے، احادیث میں اس کی تفصیل موجود ہے، مقصد اس دیت کا یہی ہے کہ ایک شخص کے قتل کی وجہ سے مقتول کے خاندان کو جو نقصان پہونچا ہے، کسی طور پر سہی، کچھ تو اس کی اشک شوئی ہو جائے، اور ہنگامی مدد تو اسے حاصل ہو، یہ خون بہا اس وقت بھی واجب ہے، جب کسی شخص کو دھوکہ میں قتل کر دے، (النساء: ۹۲) اور اس غلطی کی صورت میں صرف دیت ہی کافی نہیں، بلکہ کفارہ بھی واجب ہے، کہ مسلسل دو ماہ روزے رکھے جائیں، (النساء: ۹۲) اگر جان بوجھ کر قتل کیا ہو تو اس کے لئے کوئی کفارہ متعین نہیں کیا گیا، زندگی بھر توبہ و استغفار کرتا رہے، کیوں کہ یہ اتنا بڑا جرم اور اتنا شدید گناہ ہے کہ کوئی عمل اس کا کفارہ بن نہیں سکتا، یہ کفارہ اسی لئے ہے کہ حقوق اللہ میں جو دست درازی ہوئی اس کی کچھ تلافی ہو جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ سے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے

فرمایا: کہ آج کون سا دن ہے؟ یہ کون سا مہینہ ہے؟ اور یہ کون سی جگہ ہے؟ پھر فرمایا کہ یہ حرام مہینہ، حرام دن، اور حرام شہر یعنی حدود حرم کا علاقہ ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ مسلمان کی جان و مال اور عزت و آبرو اس سے بھی زیادہ قابل حرمت ہیں۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۶۷) اگر اس پیغمبر رحمت کی امت بھی مسلمانوں کے بلکہ انسانوں کے خون کی اہمیت و حرمت کو نہ سمجھ سکے اور اس کے ہاتھ بھی ایک دوسرے کے خون سے رنگین ہوں تو اس سے بڑھ کر بھی قابل افسوس، لائق حیرت اور تعجب انگیز کوئی بات ہوگی؟؟

(۲۴ دسمبر ۱۹۹۹ء)

ایک حادثہ —— لرزہ خیز، الم انگیز

گزشتہ دنوں شہر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے ہر اس شخص کو تڑپا دیا، جس کے سینہ میں دل اور دل میں دھڑکن ہو، اخبار کی اطلاع کے مطابق ۱۹/ اور ۲۰/ جون ۱۹۹۸ء کی درمیانی شب میں محلہ جہاں نما میں ایک خاندان نے اپنی دو بہوؤں کو نہایت ہی بے دردی اور شقاوت قلبی کے ساتھ مار مار کر ہلاک کر دیا، ان کو مسلسل زدوکوب کیا گیا اور بدن پانی سے تر کر کے دوا گیا، تا کہ زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچ سکے اور بالآخر ان کے گلے گھونٹ دیئے گئے، ان خواتین کی عمر ۴۰/ اور ۲۶/ سال تھی، ان میں ایک نے تو صرف سات ماہ قبل ہی اس گھر میں قدم رکھا تھا اور ایک کے چار بچے تھے، جن میں دو بقید حیات ہیں اور یہ سب کچھ محض جادو ٹونے کے وہم میں ہوا۔

آپ سمجھیں گے کہ شاید یہ سب کچھ ان لوگوں نے کیا ہوگا جو خدا پر ایمان اور آخرت پر یقین کی دولت سے محروم ہیں، جن کے یہاں حساب و کتاب کا کوئی تصور نہیں اور جو اس دنیا کے بعد کسی اور دنیا کا یقین نہیں رکھتے، لیکن حیرت کے کانوں سے سنئے اور یقین نہ آئے تو پھر بھی یقین کیجئے کہ یہ سب "مسلمان" کہلاتے تھے اور ان کے نام مسلمانوں ہی جیسے تھے، حقیقت یہ ہے کہ ایسے واقعات ہمارے سماج پر شرمناک داغ ہیں، ایسے داغ جن کو خون کے آنسو بھی نہیں دھو سکتے، برائی اور بدی کا ارتکاب گو افراد و اشخاص کرتے ہیں، ظلم و جور کا واقعہ ایک گھر میں پیش آتا ہے، لیکن درحقیقت پورا سماج اس کا مجرم ہے اور پوری سوسائٹی اس جرم میں شریک و سہیم ہے، جب سماج میں برائیوں پر ٹوکنے والی زبان گنگ ہو، ہاتھ ہوں لیکن ظالموں سے پنجہ آزمائی سے محروم، آنکھیں ہوں، لیکن ظلم و تعدی کے مقابلہ نابینا، طاقت و قوت اور اثر و رسوخ ہو، لیکن جرائم پیشہ عناصر کے مقابلہ

مفلوج اور ظلم ہمت، تو اس سماج میں ایسے واقعات کا پیش آنا بلکہ خدا نخواستہ بار بار پیش آتے رہنا نہ حیرت انگیز ہے اور نہ تعجب خیز!

اسلام میں انسانی جان کی حد درجہ اہمیت ہے، قرآن کی نظر میں کفر کے سوا قتل ہی ایسا جرم ہے جس کی سزا ہمیشہ کے لئے جہنم رسید ہونا بتایا گیا ہے، (نساء: ۹۳) قرآن نے خوب کہا ہے کہ ایک انسان کا قتل گویا پوری انسانیت کا قتل ہے، (مائدہ: ۳۲) کیوں کہ جب انسانی زندگی کا احترام ہی رخصت ہو گیا تو کیا مرد اور کیا عورت، کیا بڑے اور کیا چھوٹے اور کیا امیر اور کیا غریب، ہر شخص کی زندگی ایسے مجرم شخص کے ہاتھوں غیر محفوظ ہے، آخری حج کے خطبہ میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ اس مہینہ، اس دن، اس مقام یعنی حرم مکہ کی حدود حرم سے بھی بڑھ کر مسلمانوں کی جان کی حرمت ہے، (بخاری ۱۰۳۸/۲) ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جس گناہ کے بارے میں حساب و کتاب اور فیصلہ ہوگا، وہ یہی انسانی خون کا مسئلہ ہے، (ترمذی: ۲۵۹/۱) اسی لئے اسلام نے قتل کی سزا بھی قتل ہی رکھی ہے اور قرآن نے کہا کہ اس میں تمہارے لئے زندگی ہے" ولکم فی القصاص حیوۃ" (البقرۃ: ۱۷۹) کہ جب تک قاتل کو اپنے جرم کی قرار واقعی سزا کا خطرہ نہ ہو، بد قماش، بد طینت، خدا سے بے خوف، جرائم کے خوگر اور شر پسند عناصر کو نہ چند مواعظ کی زبان جرم سے باز رکھ سکتی ہے، نہ جہنم کا خوف اور نہ مختصر مدت کے لئے قید و بند کی صعوبت کا ڈر۔

پھر خاص کر اسلام نے مردوں پر عورتوں کی حفاظت کی ذمہ داری رکھی ہے اور یہی مطلب ہے مرد کے "قوام" ہونے کا، (تفسیر قرطبی: ۱۷۰/۵) اسی لئے مالی حقوق میں اسلام نے اکثر مواقع پر خواتین کو مقدم رکھا ہے، لڑکے بالغ ہو جائیں اور خود کسب معاش کے لائق ہوں تو باپ پر ان کا نفقہ واجب نہیں، لیکن لڑکیوں کا نفقہ بہر حال ان کی شادی تک واجب ہے، اور شادی کے بعد بھی اگر خدا نخواستہ طلاق یا بیوگی کی نوبت آجائے تو پھر والدین پر ان کی کفالت کی ذمہ داری لوٹ آتی ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷۴۳/۷) اگر ماں، باپ میں سے ایک اور بیٹے بیٹی میں سے ایک ہی کا نفقہ ادا کرنے کی صلاحیت

ہے تو ماں کو باپ پر اور بیٹی کو بیٹے پر ترجیح حاصل ہے۔

غور کیا جائے تو طلاق اور ایک سے زائد نکاح کی اجازت کا ایک اہم مقصد عورت کا تحفظ بھی ہے، اگر زوجین کے درمیان شدید نفرت ہو جائے اور ایک دوسرے کے ساتھ رہنا دشوار ہو جائے، پھر اس رشتے کو ختم کرنے کے لئے طلاق کا جائز راستہ مہیا ہے تو مرد طلاق دے کر نجات حاصل کر لیتا ہے، عورت کی جان کے درپے نہیں ہوتا اور اگر اس کے لئے جائز راستہ باقی نہ رہے تو پھر بد قماش لوگ اس کے لئے ناجائز اور غیر قانونی راستہ اختیار کرتے ہیں، یہی حال تعدد ازدواج کا ہے، اگر مرد کسی اور عورت کی طرف راغب ہو، جائز طور پر ایک سے زیادہ نکاح کی گنجائش نہ ہو اور طلاق حاصل کرنی بھی دشوار ہو تو پھر وہ ایک عورت کا قتل کر کے دوسری عورت کو اپنی زندگی میں لانے کی کوشش کرتا ہے، اگر ایک سے زیادہ نکاح کی گنجائش ہو تو وہ قانون شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے، غرض طلاق اور کسی مناسب ضرورت کے بغیر دوسرا نکاح ایک "ناخوشگوار واقعہ" ہے، لیکن یہ اس سے زیادہ ناخوشگوار واقعہ کو روکنے کا باعث ہے، اسی لئے اسلام نے اس کی اجازت دی ہے۔

پھر نکاح کتنا پاکیزہ رشتہ ہے، شریعت کی نگاہ میں بیوی کا وجود مرد کا ایک حصہ ہے "وخلق منها زوجها" (نساء:۱) انسان کو اپنے حصۂ بدن سے کیسی محبت ہوتی ہے؟ اپنے بدن کا حصہ خوبصورت ہو یا بدصورت، گورا ہو یا کالا، اور صحت مند ہو یا بیمار، لیکن بہر حال وہ اسے محبوب رکھتا ہے، اسی طرح شریعت نے بیوی کو محبوب رکھنے کا حکم دیا ہے، پھر نکاح کی وجہ سے بہو اور خسر، ساس اور داماد ایک دوسرے کے لئے محرم ہو جاتے ہیں، گویا بہو کی حیثیت اپنی اولاد کی ہوتی ہے، انسان بچیوں کو گھر سے رخصت کرتا ہے اور کچھ بچیوں کو اپنے گھر میں لاتا ہے، کہ یہ دوسروں کی بیٹیاں ہیں، یہاں تک کہ اگر شوہر فوت ہو جائے یا طلاق دے دے، جب بھی بہو اپنے خسر کے لئے محرم ہی رہتی ہے، اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خسر اور خوش دامن اپنی بہو کو "بیٹی" کی نظر سے دیکھیں اور بہوئیں ان کو والدین تصور کریں، اگر لوگ اس حقیقت کو سمجھ لیں تو شاید سماج میں ایسا کوئی

جھگڑے اور اختلاف باقی نہ رہے اور ہر گھر جنت نشان بن جائے۔

عورت کا قتل تو اتنا بڑا جرم ہے کہ عین میدانِ جنگ میں بھی اس کی اجازت نہیں دی گئی، پیغمبر اسلام ﷺ فوجیوں کو ہدایت فرماتے تھے کہ وہ خواتین پر ہاتھ نہ اٹھائیں۔ (مسلم: ۲/۸۳) ایک بار سپہ سالارِ فوج حضرت خالدؓ کو خاص تاکید کے ساتھ فرمایا کہ عورتوں اور مزدوروں کو ہرگز قتل نہ کیا جائے، لاتقتلن امرأة ولا عسیفا (ابوداؤد ۲/۳۶۲) ایک غزوہ کے موقعہ سے آپ ﷺ نے ایک خاتون کی لاش دیکھی تو سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ (مسلم: ۲/۸۴) اسی لئے مشہور محدث اور فقیہ امام نوویؒ نے نقل کیا ہے کہ غیر مسلم عورتوں اور بچوں کے قتل کے حرام ہونے پر پوری امت کا اجماع و اتفاق ہے۔ (شرح نووی علی مسلم: ۲/۸۴) جب عین جنگ کے دوران اور دشمن کی عورتوں پر بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تو کسی مسلمان اور وہ بھی اپنے رشتہ داروں اور قرابت مندوں پر ہاتھ اٹھانا کتنا بڑا گناہ، کتنا شرمناک عمل اور اللہ اور اس کے رسول کے دربار میں کتنا مبغوض فعل ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں۔

شریعت نے شوہر کو اس کی اجازت ضرور دی ہے کہ وہ بیوی کی نافرمانی کی صورت میں مناسب حد میں رہتے ہوئے اس کی تادیب کرے، لیکن یہ بھی اس وقت جب تین باتیں پائی جائیں: اولاً تو بیوی ایسی غلطی کرے جس کو شریعت غلطی قرار دیتی ہو، جیسے غیر محرموں کے سامنے نکلنا، قدرت کے باوجود شرعی حدود میں شوہر کے لئے زیبائش و آرائش نہ کرنا، کسی عذر کے بغیر شوہر کی فطری ضرورت کی تکمیل میں حارج ہونا، شوہر کو گالی گلوچ کرنا، غسلِ جنابت نہ کرنا اور نماز وغیرہ سے غفلت برتنا، دوسرے: پہلے ان باتوں کی فہمائش اور نصیحت کی خوب کوشش کی گئی ہو اور بار بار کی نصیحت بھی رائیگاں ہوگئی ہو، پھر چند دنوں شوہر نے ایک ہی کمرہ میں رہتے ہوئے اپنا بستر الگ رکھا ہو اور دا چار روز ترکِ تعلق کرکے اس کو متنبہ کرنے کی کوشش کی ہو، اس کے باوجود بیوی اپنی غلط روی سے باز نہ آتی ہو، تب جسمانی سرزنش کی اجازت ہے۔

پھر سرزنش بھی شرعی حدود کے اندر ہو، اس طرح نہ مارے کہ جسم پر اور جسم کے

نازک حصہ پر نہ مارا جائے، لاٹھی اور کوڑے سے نہ مارے، ایک ہی جگہ مسلسل نہ مارے، رومال سے یا ہاتھ سے مارے، لوگوں کے سامنے سرزنش نہ کرے کہ اس سے عورت کی تذلیل ہوتی ہے۔ اس کو یا اس کے ماں، باپ کو گالی دینا کسی صورت جائز نہیں، تاہم اس کو بھوکا رکھنا جائز ہے۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں بیوی کی تادیب و سرزنش کے مسئلہ میں یہ تمام تفصیلات موجود ہیں اور ان سب کے باوجود حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جو بدترین لوگ ہوں گے وہی عورتوں پر ہاتھ اٹھائیں گے۔ خسر، خوش دامن، نند، دیور، جیٹھ، جٹھانی، بھاوج کو کسی عورت کی سرزنش کا قطعاً حق نہیں۔

شریعت میں کسی بات پر اس وقت تک یقین کرنے کی گنجائش نہیں، جب تک کہ اس کے لئے مناسب شرعی ثبوت فراہم نہ ہو جائے۔ ضعیف الاعتقادی اور ایمان و یقین میں کمی کی وجہ سے آج کل توہمات اور شکوک و شبہات کی ایک عام فضا بن گئی ہے، بیماری، ابتلائیں اور آزمائشیں، حادثات، کاروبار میں نفع و نقصان، یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کوئی نفع حاصل نہیں ہو سکتا اور جب تک اللہ کی مشیت نہ ہو، کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، مصیبتوں سے بچنے کے لئے خود رسول اللہ ﷺ نے بعض آیتیں بتائی ہیں اور بعض دعائیں آپ ﷺ کی زبان مبارک سے منقول ہیں، آپ ﷺ نے سورۂ فاتحہ کو باعث شفا قرار دیا، آیت الکرسی کو بلاؤں سے حفاظت کا ذریعہ بتایا، قرآن کی آخری دو سورتیں "معوذتین" کو سحر سے تحفظ کے لئے اکسیر قرار دیا۔ ایک صاحب ایمان کے لئے ایسی چیزوں کا پڑھنا اور خدا پر بھروسہ رکھنا کافی ہے۔

خدا کے سوا کوئی غیب کی باتوں سے باخبر نہیں، کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں شخص جادو کرتا ہے، مریض اگر خود کہے کہ مجھے فلاں نے جادو کیا ہے جب بھی اس پر یقین نہیں کرنا چاہئے، کیوں کہ خود عامل حضرات کے بقول یہ شیطان ہے، جو مریض پر سوار ہو کر اس کی کیفیت بیان کرتا ہے، غور کیجئے کہ جب انسان جھوٹ بولنے سے نہیں ہچکتا تو شیطان جس کو حدیث نبوی ﷺ کے مطابق دو مسلمانوں کے درمیان تفریق و نفرت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کیا وہ جھوٹ بولتا ہو گا؟؟

درحقیقت یہ سب توہمات و بدگمانیاں ہیں، جو بے دینی اور ایمان کی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ کچھ بیکار قسم کے لوگوں کا ذریعۂ معاش ہے اور کم ہمت و کم حوصلہ لوگ ان کی خوراک ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ بعض حضرات ڈاکٹر سے رجوع کرنے کے بجائے ایسے "پیشہ ور" "کھاؤ پیاؤ" لوگوں سے مل کر اپنا مرض بڑھاتے رہتے ہیں اور اپنی دنیا بھی ضائع کرتے ہیں اور آخرت بھی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج کو اس سلسلے میں باشعور بنایا جائے، توہماتی تصورات سے ان کو آزاد کیا جائے، معاشرہ میں حوصلہ و ہمت پیدا کیا جائے کہ اگر ایک ہاتھ ظلم و جور کے لئے اٹھے تو کتنے ہی ہاتھ اس ہاتھ کو روکنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، کتنی ہی زبانیں اس پر لعن طعن کے تیر برسائیں اور سماج میں وہ اپنے آپ کو تنہا اور الگ تھلگ محسوس کرنے لگے، ہر آنکھ جو اس پر اٹھے وہ اسے اس کی ذلت و رسوائی کا احساس دلائے اور ہر زبان جو اس پر کھلے وہ اس کی شناعت اور کراہت کا اعلان کرنے لگے۔

{۱۰ جولائی ۱۹۹۸ء}

مظلوموں کی مدد — اسلامی اور انسانی فریضہ

اسلام اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین ہے، یہ کوئی نیا دین نہیں ؛ بلکہ حضرت آدم علیہ السلام ہی کے وقت سے یہ دین چلا آرہا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لئے اسی نظامِ حیات اور طریقۂ زندگی کو پسند فرمایا ہے، قرآن کا ارشاد ہے: "ان الدین عند اللہ الاسلام" (آل عمران: ۱۹) یعنی اللہ کے نزدیک جو دین معتبر و مقبول ہے وہ صرف اسلام ہے، اسی دین کو آخری اور مکمل صورت میں محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا گیا، اب جو لوگ اس سچے دین پر ایمان لے آئیں، وہ سب گویا ایک خاندان کے افراد ہیں، اور ایمان کے رشتے نے ان کو جوڑ رکھا ہے۔

یہ ایک آفاقی اور عالمگیر خاندان ہے، جیسے پانی کے ایک قطرہ کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، ہوا اسے اڑا لے جاتی ہے، اور دھوپ اسے لمحوں میں جلا کر رکھ دیتی ہے، لیکن یہی قطرہ سمندر میں مل جاتا ہے تو وہ سمندر کی وسعت و طاقت کا ایک حصہ بن جاتا ہے، اور ایک ناقابلِ تسخیر طاقت قرار پاتا ہے، اسی طرح جب کوئی انسان ایمان لاتا ہے تو وہ سمندر سے بھی زیادہ وسیع اور طاقتور خاندان کا ایک حصہ بن جاتا ہے، علاقے اور جغرافیائی سرحدیں، برادریاں اور زبانیں یہ سب انسانی تقسیمیں اور بٹوارے ہیں، اسلام کی نگاہ میں پوری انسانیت صرف دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، ایک وہ جو خدا کی طرف سے آئی ہوئی ابدی سچائی پر یقین رکھتا ہو، یہ قرآن کی زبان میں مسلم ہے، دوسرے وہ جو اس سچائی کے منکر ہیں، جنھیں قرآن کافر سے تعبیر کرتا ہے۔

افسوس کہ مغرب نے اخوتِ ایمانی پر تیشہ چلانے اور مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے قومیت کے جاہلی تصور کو جگایا اور انھیں علاقے اور زبان اور قبیلے

وخاندان کے نام پر تقسیم کرنے کی بے جا کوشش کی، اور وہ بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی رہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان ایک کنبہ اور خاندان ہیں، اور ہم سب اسی خاندان کے افراد ہیں، اخوت اسلامی کا یہ رشتہ تمام رشتوں سے زیادہ عزیز اور تعلق تمام تعلقات سے زیادہ محبوب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس آفاقی خاندان کے باہمی روابط محبت کو کس خوبصورتی کے ساتھ بیان فرمایا، آپ نے فرمایا:

تم اہل ایمان کو باہمی رحم دلی اور محبت ومودت میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے، کہ اگر ایک عضو کو بھی تکلیف ہو تو اس کے لئے پورا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(بخاری عن نعمان بن بشیر، حدیث نمبر ۶۰۱۱)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی ایک روایت میں ہے کہ ایک مومن دوسرے مومن کے لئے عمارت کی طرح ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہے، پھر خود رسول اللہ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر اس کو عملی مثال کے ذریعہ سمجھایا: المومن للمومن کالبنیان یشد بعضه بعضاً

(بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۲۶)

یہ رشتہ درد و محبت کا رشتہ ہے، دنیا میں کہیں بھی کسی مسلمان پر کوئی آزمائش آئے، ہر مسلمان کو اس پر تڑپ اٹھنا چاہئے، ایک مسلمان کو کوئی زخم لگے تو دوسرا اپنے سینے پر اس کی کسک محسوس کرے، ایک مسلمان پر کوئی پتھر پھینکا جائے، تو دوسرے کو اپنے کلیجہ پر اس کی چوٹ محسوس ہو، اس وقت ہمارے ملک میں گجرات کے مسلمان ہندو دہشت گردوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، ہزاروں افراد قتل کر دیئے گئے، سینکڑوں مرد و عورت زندہ نذر آتش کر دیئے گئے، چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں بلکہ پیٹ میں پرورش پانے والے بچے تک کو ظلم و جور کا نشانہ بنایا گیا ہے، شاید آسمان کی آنکھوں نے ایسے مظالم کم دیکھے ہوں گے، اس صورت حال نے بجا طور پر نہ صرف مسلمانوں بلکہ ان تمام لوگوں کو جن کے اندر انسانیت کی کوئی رمق باقی تھی لرزہ براندام کر کے رکھ دیا ہے، اور پورے ملک کے مسلمان گجرات

کے لئے اپنے بھائیوں کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھاتے ہیں، یہ بات بہت خوشی کی ہے کہ گجرات کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کرنے والوں میں مسلمانانِ ہند کا سب سے بڑا حصہ ہے، ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس وقت ہم گجرات کے مظلوم بھائیوں کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں، وہ احسان نہیں؛ بلکہ ایک مذہبی اور انسانی فریضہ ہے، اور مسلمانانِ گجرات کو یہ سزا ان کے مسلمان ہونے اور پورے ملک میں مسلمانوں کے کاز کی مدد کرنے کی وجہ سے دی گئی ہے۔

مدد کا ایک طریقہ تو یہ ہی ہے کہ وقتی عارضی طور پر کھانے پینے کے سامان دے دئیے، کچھ برتن اور کپڑوں کا انتظام کر دیں، یہ تو ضروری ہے ہی، لیکن اصل مسئلہ پائیدار بنیادوں پر ان مشکلات کو حل کرنے کا ہے، یہ زیادہ اہم ہے، اس وقت بہت سے لوگ سر چھپانے کے لئے سایہ سے بھی محروم ہو چکے ہیں، ان کے نئے مکانات کی تعمیر ان کی ضرورت اور پریشانی کو حل کرتا ہے، بہت سے لوگ وہ ہیں کہ جنہیں ان کی آبادیوں سے نکال دیا گیا ہے، اور ایمان سے محرومی کی قیمت پر ہی ان کو واپسی کی اجازت دی جا رہی ہے، جو ظاہر ہے کہ کسی مسلمان کے لئے زندگی اور جان کی قربانی سے بھی بڑھ کر ہے، ان کے لئے مسلمانوں کے گنجان آبادی والے علاقوں میں زمین خریدنا، بستیاں بسانا ضروری ہے، بہت سی خواتین بیوہ ہو چکی ہیں، ان کی زندگی کے لئے گذر اوقات کا مسئلہ ہے، اگر ان کی شادی کی ترتیب قرین مصلحت ہو اور وہ اس پر آمادہ ہوں، تو مسلمان اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہوں، اور بیوہ عورتوں سے نکاح کی جو سنت رسول اللہ ﷺ نے چھوڑی ہے، اس سنت کو تازہ کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے بیوہ اور مسکین لوگوں کی خدمت کرنے والوں کو، خدا کے راستے میں جہاد کرنے والے، دن میں روزہ رکھنے والے اور رات میں تہجد پڑھنے والے کے برابر قرار دیا ہے: الساعی علی الارملة والمساکین کالمجاهدین فی سبیل الله او کالذی یصوم النهار ویقوم اللیل (بخاری عن صفوان، حدیث نمبر ۶۰۰۶) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جس نے کسی مسلمان سے اس کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو دور کیا تو اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کے دن کی مصیبتوں میں مصیبت کو دور فرمائے گا۔ جس نے کسی تنگ دست پر آسانی پیدا کی، اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کے ساتھ آسانی فرمائیں گے اور جو کسی مسلمان کی غلطی کو چھپائے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی ستاری فرمائیں گے، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے اللہ تعالیٰ بھی بندہ کی مدد کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ (ابوداؤد۔ حدیث نمبر ۴۹۴۶) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت ان مظلوم بھائیوں کی مدد کس قدر اہم اور اجر و ثواب کا سامان ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حاجت مندوں کی اعانت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمجھایا ہے، جسے سن کر ہر شخص کا دل کھنچ جائے: آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائیں گے، اے ابن آدم! میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہیں کی، بندہ عرض کرے گا، پروردگار! میں کیسے آپ کی عیادت کر سکتا تھا، آپ تو خود سارے جہان کے رب ہیں، ارشاد ہوگا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تم اس کی عیادت کرتے تو تم مجھے اس کے پاس پاتے ____ پھر ارشاد ہوگا، اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا اور تو نے مجھے کھلایا نہیں، بندہ عرض کناں ہوگا میرے پروردگار! آپ تو تمام عالم کے رب ہیں، آپ کو میں کیوں کر کھانا کھلاتا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرا فلاں بندہ تجھ سے کھانے کا طلب گار ہوا تھا، تم نے اسے نہیں کھلایا، اگر تم اسے کھلاتے تو مجھے وہاں موجود پاتے۔ پھر اللہ کہیں گے: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، اور تو نے مجھے نہیں دیا، بندہ کہتا ہوگا! میرے پروردگار! آپ تو کائنات کے رب ہیں، میں آپ کو کس طرح پلاتا، فرمانِ باری ہوگا، تجھ سے میرے فلاں بندے نے تو پانی مانگا تھا، تو نے اسے پانی نہیں دیا، اگر تو اسے پلاتا تو مجھے وہاں موجود پاتا۔ (مسلم، حدیث نمبر ۶۵۵۶) ____

گویا ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کی مدد کرنا براہ راست اسے اللہ کے حضور پہنچاتا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں مخلوق کی خدمت اور

بندوں کی حاجت روائی کی کیا اہمیت ہے؟

انسان کو سب سے زیادہ فکر اور خواہش درازیٔ عمر اور خوش معاشی کی ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو چاہتا ہو کہ اس کی رزق میں وسعت اور عمر میں برکت ہو تو اسے صلہ رحمی کرنا چاہئے (بخاری، حدیث نمبر ۵۹۸۵) ۔۔۔ جو لوگ آخرت کی زندگی اور اللہ تعالیٰ کے نظام غیبی پر یقین رکھتے ہیں، ان کے لئے یہ یقیناً مژدہ جانفزا ہے۔

ایک اہم مسئلہ یتیم ہونے والے بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی کفالت کا ہے، اس سلسلہ میں بہتر طریقہ یہ ہے کہ مسلمان حسب استطاعت ایک دو بچوں کی کفالت قبول کرلیں، اور اپنے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے ان کی پرورش کریں، خاص کر جو لوگ صاحب اولاد نہیں ہیں، ان کے لئے یہ نہایت ہی بہتر صورت ہے، یہ ایک دو یتیم لڑکے یا لڑکی کی کفالت ان شاء اللہ ان کے لئے برکت ہی ثابت ہوگی، اور رسول اللہ ﷺ کی وہ سنت بھی ادا ہوسکے گی، جو یتیم کی کفالت کے سلسلہ میں آپ ﷺ نے قائم فرمائی تھی، کئی ازواج مطہرات جو آپ ﷺ کی نکاح میں آئیں وہ اپنے ساتھ یتیم بچوں کو بھی لے کر آئیں، اور آپ ﷺ نے انہیں بوجھ نہیں بلکہ خدا کی ایک نعمت سمجھ کر قبول فرمایا، آپ ﷺ نے اپنے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو ملا کر فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے، (بخاری، حدیث نمبر ۶۰۰۵) ۔ مومن کے لئے یہ کس قدر مسرور کن خوشخبری ہے! اور جو لوگ دنیا میں رسول اللہ ﷺ کی رفاقت سے محروم ہیں، ان کے لئے آخرت میں اس سعادت کو حاصل کرنے کا کتنا آسان نسخہ ہے! ۔۔۔ یتیموں کی کفالت کی ذمہ داری قبول کرنے کے علاوہ ایسے باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا سے محروم بچوں کے لئے یتیم خانے بھی قائم کرنے ہوں گے، تاکہ زیادہ سے زیادہ لڑکے اور لڑکیاں اجتماعی کفالت کے زیر سایہ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں، اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکیں، اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے سلسلہ میں ایسی بات ارشاد فرمائی ہے کہ جو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کو

بھی پھلا کر رکھ دے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: لوگوں کو یہ سوچ کر ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے بارے میں کیسے کیسے اندیشے ہوتے، اس لئے لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور درست بات کہنا چاہئے (النساء ۹۰)__ کیسی چونکا دینے والی بات ہے، کسی کو یہ خبر نہیں کہ اس کے بچوں کی پرورش اس کے ہاتھوں ہوگی یا وہ انہیں چھوڑ کر دنیا سے گزر جائے گا، اور اگر وہ انہیں چھوڑ کر دنیا سے بلالیا جائے تو اپنے بے سہارا بچوں کے بارے میں اس کے کیا جذبات واحساسات ہوں گے؟۔

(۳۱ مئی ۲۰۰۲ء)

سب سے بڑی بہادری

انسان مجموعۂ اضداد ہے، طاقت ور ایسا کہ سمندر اور پہاڑ بھی اس کی ٹھوکروں میں ہے، اور کمزور ایسا کہ پانی کا معمولی سا قطرہ اور پہاڑ کا ایک سنگ ریزہ بھی اس کی موت کے لئے کافی ہے، لطیف ایسا کہ غنچہ و گل بھی اس پر نثار ہوں، اور ذوق سے محروم ہو تو کثیف ایسا کہ شاید کوئی اخلاقی اور مادی آلائش اس کا مقابلہ کر سکے، محبت کرے تو شبنم اور بادِ نسیم سے بھی زیادہ خنک، اور نفرت پر اتر جائے تو آتش فشاں بھی اس کی گرمی عداوت پر شرمائے، اسی طرح انسانی فطرت میں ایک اہم عنصر غصہ، غیظ و غضب اور جوش و خروش کا ہے، یہ ایک آگ ہے جو انسان کے جذبات کو سلگا کر رکھ دیتی ہے، اور اس کا تمتمانا، اس کی حرارت سے ذہن الجھتا ہے، آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں، چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے، زبان بے قابو ہو جاتی ہے، اور جب غصہ شدید ہو تو اپنے اعضاء پر بھی انسان کی گرفت باقی نہیں رہتی، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، گویا غصہ کی حالت میں انسان شیطان کا نمائندہ بن جاتا ہے، اور شیطان اس کو اپنے مقصد و منشاء کی تکمیل کے لئے ذریعہ بناتا ہے۔

غصہ کی کیفیت انسان کو دینی اعتبار سے بعض اوقات سخت خسارہ میں ڈال دیتی ہے، زبان سے کفریہ کلمات نکل جاتے ہیں، طلاق دی جاتی ہے، قسم کھایا جاتا ہے جو سراسر تقاضۂ دین و ایمان کے مغائر ہوتی ہیں، یہی جوشِ غضب انسان کو قتل و قتال اور سب و شتم تک پہنچا دیتا ہے، دینی نقصان تو ہے ہی، دنیوی نقطۂ نظر سے بھی انسان کچھ کم نقصان سے دو چار نہیں ہوتا، بہت سے واقعات ہیں کہ بیوی کو طلاق دے دیتے ہیں، بعض مغلوب العقل حضرات خودکشی کر لیتے ہیں، شدتِ غضب میں اپنا ہی سامان توڑ پھوڑ کر دیتے ہیں

نہیں کرتے غصہ کی وجہ سے انسان دماغی مریض بھی بن سکتا ہے، اور قلب پر حملے سے بھی دو چار ہو سکتا ہے ۔۔۔ اگر معاشرہ کے مفاسد کا جائزہ لیا جائے تو زیادہ تر برائیاں غصہ ہی کی دین ہیں، خاندانوں کی باہمی نفرت، میاں بیوی کے درمیان ذہنی فاصلے، ایک دوسرے کی عزت ریزی، صلح کے مواقع تلاش کرنے کے بجائے مقدمہ بازی اور جنگ و جدال کا تسلسل، سماج کی یہ مہلک بیماریاں ۹۰ فیصد غصہ ہی کے سبب ہیں، اسی لئے اسلام میں غصہ کو حد درجہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے، اور غصہ پر قابو پانے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جیسے ایلوا شہد کو خراب کر دیتا ہے، اسی طرح غصہ ایمان کو، ایک اور روایت میں ہے کہ جو شخص غصہ کرتا ہے وہ جہنم کے قریب ہو جاتا ہے۔ (احیاء العلوم: ۱۶۵/۳) آپ ﷺ نے فرمایا کہ بدترین آدمی وہ ہے جس کو غصہ جلد آئے اور ختم ہو دیر سے، شرهم سريع الغضب بطئی الفئی، اور بہترین آدمی وہ ہے جسے غصہ دیر سے آئے اور جلد چلا جائے، خيرهم بطئی الغضب سريع الفئی (ترمذی، حدیث: ۲۱۹۱) ایک بار آپ ﷺ کا گذر کچھ لوگوں پر ہوا۔ کچھ لوگ پتھر اٹھا رہے تھے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ کیا کر رہے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا: پتھر اٹھا رہے ہیں، لوگ ان کی بہادری بیان کرنا چاہ رہے تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم کو ان سے بھی بہادر آدمی نہ بتاؤں؟ پھر ارشاد فرمایا: ان سے بھی بہادر وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے، ایک اور روایت میں ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس سے آپ ﷺ گذرے، جو منتشر حالت میں تھے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: فلاں پہلوان ہے کہ جس پہلوان سے بھی کشتی لڑتا ہے اسے زیر کر دیتا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم کو اس سے بھی زیادہ پہلوان شخص کے بارے میں نہ بتاؤں؟ اس سے بھی بڑا بہادر وہ شخص ہے جس پر کوئی شخص ظلم کرے، اور وہ اپنے غصہ کو پی جائے، اس نے اپنے غصہ پر بھی غلبہ پایا اور اپنے شیطان پر بھی، اور اپنے حریف کے شیطان پر بھی۔ (مجمع الزوائد: ۶۸/۸) ایک اور روایت میں ہے کہ اصل بہادر وہ ہے کہ جسے غصہ آئے خوب غصہ آئے،

چہرہ سرخ ہو جائے اور بال کھڑے ہو جائیں، پھر بھی وہ اپنے غصہ پر قابو پالے۔

(حوالہ سابق ۸/۹۹)

اسی لئے رسول اللہ ﷺ خاص طور پر غصہ سے بچنے کی نصیحت فرماتے۔ ایک صاحب نے آپ ﷺ سے نصیحت کی خواہش کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا غصہ نہ کرو، وہ بار بار پوچھتے رہے اور آپ ﷺ بار بار یہی جواب دیتے رہے۔ حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ نے عرض کیا: کہ مجھے کوئی مفید مگر مختصر نصیحت فرمایئے! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: غصہ نہ کرو، وہ بار بار نصیحت کی درخواست کرتے رہے اور آپ ﷺ ہر بار یہی جواب ارشاد فرماتے۔ (مجمع الزوائد: ۸/۷۰، بحوالہ طبرانی) حضرت ابو درداءؓ نے درخواست کی کہ ایسا عمل ارشاد فرمایا جائے جو مجھے جنت میں داخل کر دے، فرمایا: غصہ نہ کرو۔ (حوالہ سابق) حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایسا عمل جاننے کی خواہش کی جو خدا کے غضب سے بچانے والا ہو، اب بھی یہی ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کرو۔ (حوالہ سابق ۸/۹۹، بحوالہ مسند احمد) ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ سے نصیحت کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے غصہ سے بچنے کو فرمایا، میں نے اس میں غور کیا تو محسوس کیا کہ غصہ ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ الغضب یجمع الشر کلہ (حوالہ سابق)

اہل علم نے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو خاص طور پر غصہ کی کثرت سے منع فرمایا اور کہا: ایاك و كثرة الغضب (احیاء العلوم ۳/۱۶۶) امام جعفرؒ کا قول منقول ہے کہ غضب ہر برائی کی کلید ہے۔ الغضب مفتاح كل شر۔ حضرت عمرؓ اکثر اپنے خطبہ میں ارشاد فرماتے تھے کہ جو شخص حرص، خواہش نفس اور غصہ سے بچ گیا وہ کامیاب ہو گیا، مشہور محدث عبداللہ ابن مبارکؒ سے دریافت کیا گیا کہ آپ ایک جملہ میں حسن اخلاق کو بتا دیجئے، امام صاحبؒ نے فرمایا: غصہ چھوڑ دو، اترك الغضب۔

(احیاء العلوم ۳/۱۶۶)

اسی لئے غصہ کو پی جانے پر بڑا اجر ہے، حضرت معاذ بن انسؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص غصہ اتارنے پر قادر ہو اس کے باوجود وہ غصہ پی جائے اللہ تعالیٰ

اس کو قیامت کے دن تمام مخلوقات کی موجودگی میں (سرفراز و معزز) طلب فرمائیں گے، اور اسے اختیار دیں گے کہ جس حور کو چاہے انتخاب کر لے۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۰۲۱) اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ غصہ پر قابو پانا، اور غصہ کے وقت اپنے آپ کو عدل اور اعتدال پر قائم رکھنا آسان نہیں، اور انسان کے اخلاق و رواداری کا اصل امتحان اسی موقع پر ہے، اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے خوب فرمایا کہ آدمی کی بردباری کو اس وقت دیکھو جب وہ غصہ کی حالت میں ہو، اور اس کی امانت و دیانت کا اندازہ اس کی طمع و حرص کے مواقع پر، جس کو تم نے حالتِ غضب میں نہیں دیکھا تم کو اس کی بردباری کا علم نہیں، اور جس کو تم نے حرص و لالچ کے مواقع پر نہیں دیکھا تم کو اس کی دیانت کی خبر نہیں۔ (احیاء العلوم: ۳/۱۲۶)

حقیقت یہ ہے کہ غصہ کو پی جانا بہت بڑا عمل ہے، اور جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا، شجاعت اور بہادری کا کام ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے غصہ پر قابو پانے کی مختلف تدابیر بتائی ہیں، آپ ﷺ نے اس کی ایک تدبیر یہ بتائی کہ ایسے وقت میں آدمی "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھے، ایک صاحب اتنا غضب ناک تھے کہ لگتا تھا کہ ابھی ان کی ناک پھٹ پڑے گی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ کہے تو اس کا غصہ فرو ہو جائے، دریافت کیا گیا: وہ کیا کلمہ ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" (ابوداؤد، حدیث: ۴۷۸۰، بخاری، حدیث: ۶۰۴۸) وجہ اس کی ظاہر ہے کہ غصہ ایک شیطانی حرکت ہے، جب انسان اس موقع پر تعوذ پڑھے گا، تو اللہ کی مدد سے اس شیطانی حرکت پر غلبہ پالے گا، نفسیاتی اعتبار سے بھی اس کلمہ کو پڑھتے ہوئے آدمی کا ذہن اس جانب منتقل ہوتا ہے کہ وہ اس وقت ہیجان کا شکار ہے، اس خیال سے وہ اپنے آپ کو موجودہ کیفیت سے بآسانی نکال سکے گا۔

غصہ پر قابو پانے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ غصہ کے وقت انسان کچھ نہ بولے اور چپ سادھ لے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو خاموش رہے، اذا غضب احدکم فلیسکت۔ (مسند احمد، حدیث نمبر ۲۱۳۶) کیونکہ غصہ کی حالت میں انسان جتنا زیادہ بولتا ہے، جوشِ غضب بڑھتا جاتا ہے، اور اکثر اوقات ایسی

باقی رہ جاتا ہے جو خود اس کے لئے نقصان دہ ہوتی ہے۔ غصہ دور کرنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ انسان اپنی موجودہ کیفیت میں تبدیلی لے آئے، کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو غصہ کے وقت اسی تدبیر کے اختیار کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ (ابوداؤد حدیث نمبر: ۴۷۸۲، عن ابی ذر غفاری)

ابو وائل ایک واقعہ کہتے ہیں، وہ عروہ بن محمد سعدی کے پاس گئے، عروہ سے ایک شخص نے ایسی بات کہی کہ ان کو غصہ آگیا، وہ اٹھ گئے، اور وضوء کر کے واپس آئے، پھر ایک حدیث بیان فرمائی کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: غصہ شیطان کی طرف سے ہے، شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے، اس لئے جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضوء کر لینا چاہئے۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر ۴۷۸۴) معلوم ہوا کہ وضوء بھی غصہ پر قابو پانے میں ایک مؤثر طریقہ ہے۔ روحانی طور پر تو وضوء میں غصہ فرو کرنے کی تاثیر ہوتی ہی، کیوں کہ یہ ارشاد نبوی ہے اور آپ ﷺ کے ارشاد سے بڑھ کر صحیح و درست بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن علاوہ اس کے نفسیاتی اعتبار سے بھی اس کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ پانی کی ٹھنڈک جسم کی حرارت، تکان، اور غیر معتدل کیفیت کو دور کرنے اور معتدل بنانے میں بہت مؤثر ہوتی ہے، امام غزالی نے کچھ اور تدبیریں بھی غصہ پر قابو پانے کی بتائی ہیں، ان میں سے یہ ہے کہ غصہ پر قابو پانے کے فضائل سے متعلق آیات و احادیث کو اپنی نگاہ میں رکھے، اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے ڈرائے، غصہ سے انجام کار عداوت و انتقام کی جو آگ فریق مخالف کے دلوں میں سلگے گی اس کو اپنے ذہن میں مستحضر کرے، غصہ کے وقت آدمی کی صورت میں جو بگاڑ آتا ہے اس کو ذہن میں لائے، اور سوچے کہ گویا وہ اس کیفیت میں ایک کاٹ کھانے والے کتے اور حملہ کرنے والے درندے کی طرح ہے، وغیرہ (احیاء العلوم: ۳؍۱۷۲-۱۷۳)

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام تدابیر کا حاصل اور غصہ پر قابو پانے کا سب سے مؤثر ذریعہ خدا کا خوف ہے، خدا سے بے خوفی انسان کو ظلم پر جری بناتی ہے، اور خدا کا خوف انسان کے بے قابو جذبات کو تھام لیتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں تھے جن کو زیادہ

غصہ آتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ احکام خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں بھی ان کی کوئی مثال نہیں تھی، اسی لئے ان کے بارے میں لوگوں نے لکھا ہے کہ کان وقافا عند کتاب اللہ ایسا بھی ہوا کہ آپ نے کسی شخص کو اس کی غلطی کی بناء پر کوڑے لگانے کا حکم دیا، اس نے آیت قرآنی پڑھ دی کہ "عفو درگذر" کو اختیار کرو۔ بھلائی کا حکم دو، اور ناواقف لوگوں سے گریز کرو۔ "خذ العفو وامر بالعرف واعرض عن الجاهلين" (اعراف: ۱۹۹) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک لمحہ غور فرمایا اور اس کو چھوڑ دیا۔ (احیاء العلوم: ۳/۲۰۵) اگر سینہ میں خوف خدا کی آگ موجود ہو تو وہ غصہ کی آگ کو کھا جائے گی، اور اگر دل خوف الٰہی سے خالی ہو تو غصہ کی آگ اسے کھا جائے گی دنیا میں اور آخرت میں بھی۔ غصہ برائیوں کی جڑ ہے اور غصہ پینا سب سے بڑی بہادری۔

(۱۱/اکتوبر ۱۹۹۹ء)

کا کام انجام دیتے ہیں، ان میں بچے بھی ہیں، جوان بھی، اور بوڑھے بھی، مرد بھی ہیں اور خواتین بھی، کم سن لڑکیاں بھی، جوان لڑکیاں اور سن رسیدہ عورتیں بھی، گداگری کے اس پیشہ میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں، ویسے گروہ بھی پکڑے گئے ہیں جو دیہاتوں اور دور دراز علاقوں سے بچوں کو پکڑ کر لاتے ہیں، اور انھیں کسی قدر معذور بنا کر ان سے گداگری کراتے ہیں، زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ گداگری کے لئے بھی جدید ذرائع کا استعمال شروع ہو گیا ہے، چنانچہ بعض فقراء انٹرنیٹ کی مدد سے عالمی سطح پر اپنی رسائی کو وسیع کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گداگروں کا یہ گروہ اس کو ایک آسان اور سہولت بخش ذریعہ معاش تصور کرتا ہے، چند ماہ پہلے اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کہ حیدرآباد میں گداگروں کی آمدنی کا اوسط تین تا چار ہزار روپے ماہانہ ہے، خاص خاص مواقع جیسے رمضان المبارک اور عید وغیرہ میں اس میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ اس پیشہ سے دستبردار ہونے کو کسی طور تیار نہیں ہیں، اگر آپ انھیں کام کرنے کو کہیں یا خود اپنے یہاں کام کرنے کی دعوت دیں تو وہ ایسا منہ بنائیں گے کہ گویا آپ نے ان کی بے عزتی کی ہے، غرض وہ اپنے پیشہ پر قانع بھی ہیں اور مطمئن بھی، اور انھیں اس پر کوئی حجاب ہے اور نہ عار، اس بات سے مزید دکھ ہوتا ہے کہ ان میں بہت ہی قابل لحاظ تعداد ہمارے مسلمان بھائیوں کی ہے، اور جس امت کو سب سے بڑھ کر غناء اور استغناء کی تعلیم دی گئی ہے، وہی اس اخلاقی بیماری میں پیش پیش ہے۔

اسلام سے پہلے بعض مذاہب میں مذہبی لوگوں کے لئے کسب معاش کی اجازت نہیں تھی، اور ان کا گزر اوقات اسی طرح ہوتا تھا کہ وہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کریں اور لوگوں کی نذر و نیاز پر زندگی گزاریں، ہندو بھائیوں کے یہاں برہمن کے حقوق میں یہ بات شامل تھی کہ لوگ اسے دان کیا کریں، بدھسٹوں کے یہاں مذہبی رہنماؤں اور بھکشوؤں کو کسب معاش کی ممانعت ہے، اور وہ لوگوں کی دچھنا پر زندگی گزارا کرتے تھے، عیسائیوں کے یہاں جب رہبانیت اور ترک دنیا کے فلسفہ نے قبول عام حاصل کیا تو نہ

صرف مذہبی رہنما، بلکہ عوام میں بھی زاہد قسم کے لوگوں نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ وہ کسب معاش چھوڑ دیں اور لوگوں کے دیے ہوئے پر اپنی زندگی گزاریں، لیکن اسلام نے قول و عمل سے اس کسب معاش کو ضروری قرار دیا، قرآن نے کہا کہ بندگی سے فارغ ہونے کے بعد کسب معاش کی کوشش کرنی چاہئے، اور مال کو فضل الٰہی سے تعبیر کیا (الجمعہ: ۶۲، ۱۰) رسول اللہ ﷺ نے خود تجارت فرمائی، حضرت ابوبکر ؓ، حضرت عمر ؓ، حضرت عثمان ؓ اور اکابر صحابہؓ نے تجارت کی، حضرت علی ؓ اور بہت سے صحابہؓ نے محنت و مزدوری کر کے اپنی ضروریات پوری کیں اور حلال رزق کی تحسین فرمائی گئی۔

اسلام نے توکل کی تعلیم ضرور دی، لیکن لوگوں نے جو بے عملی اور فرائض سے پہلو تہی کو توکل کا مترادف سمجھ رکھا تھا، اس کی اصلاح بھی فرمائی، اسلام نے بتایا کہ توکل یہ نہیں ہے کہ اسباب دنیا کو ترک کر دیا جائے، بلکہ توکل اسباب کو اختیار کرنے کے بعد نتائج کو اللہ پر چھوڑ دینے کا نام ہے، اس لئے کسب معاش توکل کے منافی نہیں، گداگری پیدا ہی اس سے ہوتی ہے کہ انسان کسب معاش کی فکر دوسروں پر چھوڑ دے، اس کے سد باب کے لئے آپ ﷺ نے ایک طرف کسب معاش کی اہمیت کو واضح فرمایا، گداگری کے اصل سبب کو ختم کرنا چاہا۔

دوسری طرف گداگری کی مذمت فرمائی، اور اسے سختی سے منع کیا، ایک صاحب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور کچھ سوال کیا، آپ نے ان سے فرمایا کہ تمہارے پاس کیا کچھ سامان ہے؟ اس نے کہا میرے پاس تو فقط ٹاٹ اور پیالہ ہے، آپ نے وہ دونوں چیزیں منگوائیں اور ان کی بولی لگائی، ایک صاحب نے ایک درہم قیمت لگائی، دوسرے شخص نے دو درہم، آپ نے اسے دو درہم میں فروخت کر دیا، پھر ایک درہم میں کلہاڑی کا پھل منگایا، اور کلہاڑی بنا کر اسے حوالہ کر دیا، اور ایک درہم اسے دے کر ارشاد ہوا کہ اس سے اپنی ضرورت پوری کریں، اور کلہاڑی سے لکڑی کاٹ کر لائیں اور فروخت کریں، اور ایک ماہ تک پھر کہیں بھیک مانگتے ہوئے نظر نہیں آئیں، ان صاحب نے اس ہدایت پر عمل کیا، اور ایک ماہ کے بعد اس حال میں تشریف لائے کہ کئی درہم ان کے پاس

موجود تھے، اور وہ گداگری کو چھوڑ چکے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ بات کہ تم اپنی پیٹھ پر لکڑی کے گٹھے کاٹ کر لاؤ اور اسے فروخت کرو، اس سے بہتر ہے کہ تم لوگوں کے سامنے دستِ سوال پھیلاؤ، وہ چاہیں تو دیدیں، چاہیں تو نہیں دیں۔"

اس طرح کے بعض اور واقعات بھی منقول ہیں، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ دو شخص خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور کچھ طلب کیا، آپ نے مشورہ دیا کہ جنگل جاؤ، لکڑی کاٹو اور اسے فروخت کرو، انہوں نے ایسا ہی کیا، پہلے تو کھانے پینے کی اشیاء خریدیں، پھر سونا خریدا، پھر سواری کے لئے گدھے خرید لئے، اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے رسول اللہ ﷺ کے حکم میں برکت رکھی ہے۔

(مجمع الزوائد ۳/۹۳)

آپ ﷺ نے سوال کرنے سے صحابہ کو اس درجہ منع فرمایا اور اس کی تعلیم دی کہ وہ معمولی چیزیں مانگنے سے بھی احتراز کرتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ اگر اونٹنی کا لگام نیچے گر جاتی تو اونٹنی کو بٹھاتے اور خود لگام لیتے، لگام بھی دوسروں سے مانگنے کے روادار نہیں ہوتے۔ (حوالہ سابق) یہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا نتیجہ تھا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ دونوں کا بیان ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے عہد لیا کہ کسی سے سوال نہ کریں، یہاں تک کہ اگر کوڑا نیچے گر جائے تو وہ بھی دوسرے سے نہ مانگیں۔

(مجمع الزوائد ۳/۹۴)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص مستغنی ہونے کے باوجود سوال کرے، وہ اپنے لئے جہنم کی چنگاریوں میں اضافہ کر رہا ہے، دریافت کیا گیا: مستغنی ہونے سے کیا مراد ہے؟ "وَمَا ظَهْرُ غِنًى" ارشاد ہوا: جس کے پاس رات کا کھانا موجود ہو، (حوالہ سابق) گویا جس شخص کے پاس ایک وقت کا کھانا موجود ہو اس کے لئے دستِ سوال دراز کرنا روا نہیں، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سوال قیامت کے دن صاحبِ سوال کے چہرے پر خراش کی صورت میں ظاہر ہوگا، اب جو چاہے اسے اپنے چہرہ پر باقی رکھے، (حوالہ سابق ۹۶) اور حضرت حبشی بن جنادہ رضی اللہ عنہ کی روایت

میں آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جس نے فقر و محتاجی کے بغیر سوال کیا گویا وہ چنگاری کو کھاتا ہے۔ (حوالہ سابق) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ بے ضرورت مانگنے کے باوجود سوال کرنا قیامت کے دن اس کے چہرے پر عیب کی صورت اختیار کرے گا، کانت شینا فی وجھہ یوم القیامۃ (حوالہ سابق) غور کیجئے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں اگر چہرے پر بدنما عیب آجائے تو انسان اس کو دور کرنے کے لئے کتنا پریشان ہوتا ہے، آخرت کی دائمی زندگی میں جب اہل جنت خوبصورت ترین شبیہ میں ہوں گے، انسان کو اپنے عیب دار اور داغ دار چہرے پر کتنی شرمساری ہوگی، خاص کر ایسی صورت میں کہ لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ رنگ و نور کی اس بستی میں کوئی شخص اتفاقی اور پیدائشی طور پر بدصورت نہیں ہے، بلکہ اس کی بدصورتی اس کی بد اعمالیوں کا عکس ہے، کتنی عجیب ہے کہ بیٹھے سنورنے والا انسان اس دائمی بدرونقی اور بدصورتی کے بارے میں فکرمند نہ ہو!

گداگری فقر و احتیاج کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کا اصل سبب تن آسانی و کاہلی، انگاری، اور مفت خوری و بطن پروری کی خو ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ انسان نے حیا اور غیرت کی چادر کو تار تار کر دیا ہے، اگر انسان میں قوت ارادی اور خودداری ہو اور اپنی عزت و آبرو عزیز ہو تو وہ دوسروں کے سامنے دست سوال نہیں پھیلا سکتا، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے آپ کو عفیف و آبرومند رکھنا چاہے اللہ تعالیٰ اسے عفیف رکھتے ہیں، اور جو مستغنی رہنا چاہے اللہ تعالیٰ اسے استغناء عطا فرماتے ہیں، (مجمع الزوائد ۳؍۹۵، بحوالہ مسند احمد) —— خودداری کے اسی مزاج کو باقی رکھنے کے لئے اسلام نے زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم کیا، کہ لوگ بیت المال میں زکوٰۃ جمع کریں، اور بیت المال ضرورت مندوں کا حسب ضرورت تعاون کرے، کیوں کہ سرکاری ادارہ سے کوئی مدد حاصل کرنے کی صورت انسان کا جذبۂ خودداری ختم نہیں ہوتا اور حجاب و حیاء کی کیفیت باقی رہتی ہے، جب انسان ایک دوسرے سے سوال کرنے لگتا ہے تو پہلے زبان کھولتے نہیں کھلتی، زبان پر پتھر رکھ کر اپنا مطلب بتلاتا ہے، آنکھوں میں خجالت کی کیفیت ہوتی ہے، نہ زبان کو اظہار مدعا میں کوئی جھجک باقی رہتی ہے، اور نہ پھر لوگوں کے سامنے دراز ہوتے ہیں

کوئی عار۔

کسی بھی قوم کے لئے یہ بات بہت شرمناک ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے جو قوم کے مستقبل ہوتے ہیں، جوان مرد و عورت جن میں محنت اور تگ و دو کی صلاحیت ہوتی ہے، جو قوم کا اثاثہ اور اس کے ہاتھ پاؤں ہیں، ان میں بے عملی اور بے ضمیری پیدا ہو جائے، اس سے زیادہ قابل افسوس بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

گداگری کے سد باب کے لئے مثبت اور منفی اقدامات کی ضرورت ہے، مثبت اقدام یہ ہے کہ ایسے بچوں کو تعلیم میں لگایا جائے، بہت سے سرکاری و غیر سرکاری ادارے ہیں جہاں بچوں کی مفت تعلیم کا انتظام ہے، انہیں ایسے اداروں میں پہنچایا جائے، جو خواتین اور مرد کام کرنے کے لائق ہیں انہیں مزدوری پر لگایا جائے، آج کل مزدوروں کی کمی بہت زیادہ ہے، اصل دشواری تعلیم یافتہ بے روزگاروں کے لئے ہے، اور گداگری کے پیشہ میں زیادہ تر ناخواندہ اور ان پڑھ لوگ ہیں، انہیں محنت مزدوری پر آمادہ کیا جا سکتا ہے، جو لوگ واقعی جسمانی اعتبار سے معذور ہوں ان کے لئے اقامت گاہیں قائم کی جائیں، یا گورنمنٹ کی طرف سے بنے ہوئے رفاہی اداروں تک ان کو پہنچایا جائے۔

منفی اقدام سے مراد یہ ہے کہ گداگری کی حوصلہ شکنی کی جائے، مسجدوں اور درگاہوں کے ذمہ داران انہیں وہاں بیٹھنے اور بھیک مانگنے سے روکیں، مذہبی اجتماعات، جمعہ و عیدین کے مواقع پر بھی انہیں بھیک مانگنے سے منع کیا جائے اور ان کی حوصلہ شکنی کی جائے، ان کو بھیک نہیں دی جائے، یہ بھیک مانگیں تو کام کرنے کی ترغیب دی جائے، اس طرح ان کی حوصلہ شکنی ہوگی، اور یہ بے عزتی طریقہ پر کمانے کے عادی ہوں گے بہت سے لوگ جمعہ وغیرہ میں کھلے پیسے لے کر آتے ہیں، اور دو چار روپیہ ہر فقیر کو دیتے چلے آتے ہیں، بظاہر یہ کار خیر ہے؛ لیکن بالواسطہ یہ اپنی قوم کے ایک گروہ کو گداگری کا عادی بنانا ہے، اس لئے اس سے اجتناب ہی قوم کے مفاد میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ہمارے سامنے موجود ہے، کہ ایک طرف آپ نے بھیک

مانگنے والوں کو دینے سے انکار کر دیا، اور دوسری طرف انہیں محنت مزدوری کر کے اپنی ضروریات پوری کرنے کی ترغیب بھی دی، اور اس کی تدبیر بھی فرمائی۔ اگر ہم اپنی قوم کو اس لعنت سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی ان میں یہ مزاج پیدا کرنا ہوگا کہ وہ اپنے گاڑھے پسینے بہا کر کمائیں اور آدھے پیٹ کھائیں، لیکن دوسروں کے سامنے سوال کے ہاتھ پھیلا کر بے آبروئی کا راستہ اختیار نہ کریں!!

(۲۳ر اگست ۲۰۰۲ء)

فضول خرچی ـــــ روز افزوں بیماری

عام طور پر لوگ معاشی قوت کا راز اس بات کو سمجھتے ہیں کہ آمدنی کے ذرائع میں اضافہ ہو اور اسے دس ہزار کے پندرہ ہزار ملنے لگیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ معیشت کے استحکام کا تعلق آمدنی سے بھی ہے اور خرچ سے بھی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کمانے سے زیادہ مشکل اور اہم خرچ کرنے کا فن ہے، اگر انسان اپنی زندگی کا ایک نظام بنائے اور خرچ میں اپنے آپ کو اس کا پابند رکھے، تو نسبتاً کم آمدنی کے ساتھ بھی وہ اپنے سے زیادہ کمانے والوں کے مقابلہ خوشگوار اور خوش حال زندگی گذار سکتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ جن امور میں پیسے خرچ کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے، اس کے چار حصے کرے: بہت ضروری، ضروری، متوسط ضروری اور غیر ضروری، غیر ضروری بغور کیا جائے تو انسان ان چاروں مدات سے گذرتا ہے، "بہت ضروری مصارف" کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، جیسے کھانے پینے کی اتنی مقدار جو آدمی کی بقا کے لئے ضروری ہے، سادگی کے ساتھ علاج و معالجہ، بچوں کی کفایت کے ساتھ تعلیم، فضول خرچی سے بچتے ہوئے شادی بیاہ، یہ بنیادی ضروری اخراجات ہیں، "ضروری مصارف" میں مناسب اور طبیعت کے لئے موزوں کھانے پینے کا نظم، بقدر ضرورت سواری، سہولت بخش علاج، سماجی مزاج سے ہم آہنگ بقدر ضرورت کپڑے وغیرہ داخل ہیں، ان کو فقہ اسلامی کی اصطلاح میں "حاجت" کہتے ہیں، تیسرا درجہ ایسی چیزوں کا ہے جو ضروری نہیں، لیکن انسان مختلف شعبہ ہائے زندگی میں سہولت کے لئے ان کا طالب ہوتا ہے، جیسے آرام دہ سواری، ایک حد تک راحت بخش علاج وغیرہ، یہ ضروریات نہیں ہیں، البتہ "جائز خواہشات" ہیں اور فقہ اسلامی کے ماہرین کی زبان میں "تحسینات" ہیں، چوتھا درجہ ایسی چیزوں کا ہے، جو بالکل غیر ضروری اور فضول

اَنْفُسُ تُحْضَرُ" (محمد اسعد و ۱۳) دنیا خواہشات کی تکمیل کی جگہ نہیں ہے، بلکہ ضروریات پوری کرنے کی جگہ ہے۔ یہاں انسان کا اپنی خواہشات کا غلام بن جانا منزل کو بھول کر راستے کو مقصد بنا لینے کے مترادف ہے، لیکن افسوس کہ انسان اسی کیفیت میں مبتلا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے خوب فرمایا کہ قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں جو انسان کے پیٹ کو بھر سکے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنی زندگی کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لے اور دیکھے کہ وہ کہاں ضروریات کی حد سے آگے بڑھ کر خواہشات کے دام میں گرفتار ہو چکا ہے اور اپنی زندگی میں سادگی لانے کی کوشش کرے۔ آپ سادہ زندگی گذار کر اپنے سماج میں زیادہ باعزت رہ سکتے ہیں، اور اپنے آپ کو پُرسکون بھی رکھ سکتے ہیں۔

ممکن ہے کہ آپ کے پاس عمدہ سواری نہ ہو، آپ کے گھر میں دیدہ زیب فرنیچر نہ ہو، لیکن آپ کے دروازہ پر کوئی قرض وصول کرنے والا دستک نہ دے رہا ہو اور نہ کوئی آپ کے نادہندہ ہونے کی شکایت کرنے والا ہو، تو آپ باعزت طریقہ پر سماج میں زندگی گذار سکیں گے اور آپ ذہنی تناؤ کی کیفیت سے محفوظ رہیں گے۔ یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔

اخراجات کا وہ طریقہ جسے میں نے "غیر ضروری اور فضول" سے تعبیر کیا ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے گوارا اور ناجائز ہے۔ قرآن مجید نے ایک سے زیادہ مواقع پر فضول خرچی کی ممانعت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اسراف نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے: "لَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ" (انعام: ۱۴۱) ایک اور موقع پر فضول خرچی سے روکتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں: "اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ" (الاسراء: ۲۷) فضول خرچی دو طریقوں پر ہوتی ہے، ایک یہ کہ بے جا مصرف میں پیسے خرچ کئے جائیں، جیسے ضرورت سے زیادہ روشنی میں، آتش بازی میں، گانے بجانے میں، دکھاوے کے اظہار اور زیادہ تشہیر میں، حد یہ ہے کہ بعض لوگ حج کے لئے جانے اور آنے کے موقع سے بھی کثیر رقم خرچ کر کے اخبارات میں مصور اشتہار طبع کراتے ہیں، یہ سب

بے محل خرچ ہیں، جو شرعاً جائز نہیں، بے محل خرچ کرنے کو قرآن نے "تبذیر" سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ تبذیر ناحق امور میں خرچ کرنے کا نام ہے، "الانفاق فی غیر حق" (تفسیر ابن کثیر ۳/۳۶) فضول خرچی کی دوسری صورت یہ ہے کہ جتنی چیزوں میں خرچ کرنا چاہئے، انہیں میں خرچ کیا جائے، لیکن ضرورت سے زیادہ کھانا ایک غیر ضروری چیز ہے، لیکن اس میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف ہے، لباس و پوشاک دنیا میں مطلوب ہے، لیکن کئی کئی قیمتی کپڑے بنانا اور ایک جوڑے کی جگہ دس جوڑے کا اہتمام کرنا فضول خرچی ہے اور اسی کو قرآن نے "اسراف" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

اسلام فضول خرچی کو نہایت ناپسندیدہ نظر سے دیکھتا ہے اور اس نے ہر باب میں فضول خرچی کو منع کیا ہے، حضرت سلمان فارسیؓ سے مروی ہے کہ دنیا میں جو جتنا زیادہ آسودہ ہو کر کھاتا ہوگا، قیامت کے دن وہ اسی قدر بھوکا ہوگا "ان اکثر الناس شبعا فی الدنیا اطولهم جوعا یوم القیامة" (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۳۳۵۱) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جو کچھ طبیعت چاہے کھا گذرنا اسراف ہی کی ایک صورت ہے، "ان من السرف ان تاکل کل ما اشتهیت" (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۳۳۵۲)

آپ ﷺ نے اسے بھی پسند نہیں فرمایا کہ کھاتے ہوئے اگر روٹی کا ٹکڑا ہاتھوں سے گر جائے تو اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے، معمول مبارک تھا کہ گر کوئی ٹکڑا گر جاتا تو اسے اٹھاتے، پونچھتے، پھر اسے تناول فرماتے۔ (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۳۳۵۳) لباس و پوشاک میں بھی آپ ﷺ نے اعتدال و میانہ روی کی تلقین فرمائی، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے شہرت اور دکھاوے کا لباس پہنا، اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ذلت و رسوائی کا لباس پہنائیں گے۔ (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۳۶۰۶) ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کھاؤ، پیو، صدقہ کرو اور پہنو، البتہ فضول خرچی نہ ہو اور تکبر نہ ہو۔ (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۳۶۰۵) اسی لئے آپ ﷺ نے بسیار خوری کو بھی بہت ناپسند فرمایا ہے۔

نہ صرف کھانا پینا اور پہننا اوڑھنا، بلکہ دینی امور میں بھی آپ ﷺ نے فضول خرچی کو پسند نہیں فرمایا۔ ثابت بن قیس نامی ایک صحابی نے ایک دن پانچ سو کھجور کے درختوں کے پھل کاٹے اور اسی دن پورے تقسیم کر دیئے، اہل وعیال کے لئے کچھ نہیں رکھا تو آپ ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا اور اسی موقع سے حکم ربانی نازل ہوا: ولا تسرفوا۔ (الجامع لاحکام القرآن: ۱۱۰/۷) یہاں تک کہ آپ وضو اور غسل میں بھی ضرورت سے زیادہ پانی استعمال نہیں فرماتے۔ غسل ایک "صاع" پانی سے کرتے، جو تین لیٹر سے کچھ زیادہ ہوتا ہے اور اس کے چوتھائی پانی سے وضو فرماتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص نہر کے پاس ہو جب بھی وضو میں ضرورت سے زیادہ پانی کے استعمال سے گریز کرے اور ایسا بھی ہوا کہ آپ ﷺ نے نہر کے پاس برتن میں پانی لے کر وضو فرمایا اور جو پانی بچ رہا اسے دوبارہ نہر میں ڈال دیا۔ (مجمع الزوائد: ۲۱۹/۱)

حقیقت یہ ہے کہ اسراف اور فضول خرچی نے ہمارے سماج کو ایک ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے جس کی سزا معاشرہ کا ہر شخص بھگت رہا ہے، کیوں کہ جب کسی معاشرہ میں فضول خرچی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے تو لوگ خواہی نخواہی اس معیار کو پورا کرنا چاہتے ہیں، چاہے اس کے لئے کتنی بھی مشقت اٹھانی پڑے، فضول خرچی جہاں ایک شخصی مرض ہے وہیں ایک قومی مرض بھی ہے۔ غور فرمایئے کہ اس وقت ہندوستان کے ذریعہ آمدنی میں سب سے بڑا ذریعہ قرض ہے، ملک کی مجموعی آمدنی کا پچیس فیصد قرض سے حاصل ہوتا ہے اور اخراجات کی سب سے بڑی مد بیرونی سود کی ادائیگی ہے، کہ کل بجٹ کا ستائیس فیصد صرف بیرونی سود کی ادائیگی پر خرچ کیا جاتا ہے، عالمی مالیاتی بینک کی رپورٹ کے مطابق اس وقت ہر ہندوستانی بچہ جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، وہ دس ہزار روپے کا مقروض ہوتا ہے، ان بڑھتے ہوئے اخراجات کی سب سے بڑی وجہ سرکاری اخراجات میں بڑھتا ہوا اضافہ ہے، ۱۹۹۸ء، ۱۹۹۹ء میں قریب ستائیس لاکھ کروڑ روپے صرف ہندوستانی حکمرانوں کے اخراجات ہیں، ۱۹۹۷ء میں مرکزی انتظامیہ کی تنخواہ اور الاؤنس کی مد میں تقریباً چھتالیس ہزار کروڑ کا اضافہ ہوا اور ۱۹۹۹ء میں یہ اضافہ کئی چند ہو چکا ہے۔

اسی طرح الیکشن کا معاملہ ہے، تیرہویں لوک سبھا کے انتخاب میں الیکشن کمیشن کا اندازہ ہے کہ ایک ہزار کروڑ روپے خرچ ہوں گے اور سیاسی پارٹیاں بھی اتنی ہی مقدار میں سفید سرمایہ (White Money) خرچ کریں گی، لیکن مبصرین کا اندازہ ہے کہ امیدواروں کی طرف سے جائز و ناجائز رقم ملا کر پچاس ہزار کروڑ سے کم اخراجات نہیں ہوں گے، اس طرح اندازہ کیجئے کہ ہمارے ملک کی دولت کے بجٹ میں اور پھر غیر ضروری خرچ میں تو یہ کتنا کثیر سرمایہ ضائع ہو رہا ہے؟ یہ تو فضول خرچی کا ایک کھلا ہوا اور سادہ سا حساب ہے، سرکار تو جو فضول خرچی کرتی ہے، وہ کرتی ہی ہے، نجی کمپنیوں کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ نہیں، مثلاً ورلڈ کپ ۱۹۹۹ء میں ملک کی مختلف کمپنیوں نے اس کرکٹ میچ کے اشتہار اور اس اشتہار کے پس پردہ پبلسٹی پر سو کروڑ روپے خرچ کئے ہیں، اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صرف شخصی اور انفرادی بلکہ قومی اور ریاستی سطح پر بھی فضول خرچی کی بیماری کس قدر روز افزوں ہے؟! ایک ایسا ملک جو تعلیم اور صحت جیسی اہم ضروریات پر اپنے بجٹ کا دس فیصد بھی خرچ کرنے کے موقف میں نہیں ہے، ایک ایسا ملک جس میں کروڑوں انسان خط غربت سے نیچے زندگی بسر کرتے ہوں، ہزاروں افراد کے پاس سر چھپانے کے لئے جگہ نہ ہو، ایک وقت کھانے کے بعد دوسرے وقت کھانے کا انتظام نہ ہو، اور جو قوم اپنے ہزاروں کم عمر اور معصوم بچوں کو ہوٹلوں میں برتن دھونے اور اس طرح اپنی روزی کمانے پر مجبور ہو گیا ہو، کیا اسے یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں یوں بے گندے اور آلودہ پانی کی طرح پیسے بہائیں؟؟

(۲۰ اگست ۱۹۹۹ء)

اپنے روپے آپ نہ جلائیے!

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اکثر نعمتوں کو متضاد صفتوں کا حامل بنایا ہے، "ہوا" انسان کے لئے ہمہ وقتی ضرورت ہے، لیکن اگر یہ آندھی اور طوفان کی شکل اختیار کرلے تو بے رونق آبادیوں کو تاخت و تاراج کر کے چھوڑ دیتی ہے، پانی انسان کے لئے کتنی عظیم الشان نعمت ہے، لیکن یہی پانی جب سیل رواں بن کر کھیتوں کو اجاڑتا، درختوں کو اکھاڑ پھینکتا اور مکانوں کو غرقاب کرتے ہوئے زمین بوس کرتا چلا جاتا ہے تو ایسی آفت بن جاتا ہے کہ کیا انسان اور کیا حیوان، سب جائے پناہ ڈھونڈتے رہتے ہیں، اور کتنے ہی انسان سیلاب کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

اسی طرح آگ بھی اللہ کی ایک نعمت ہے، گو آگ کے نام سے گھبراہٹ ہوتی ہے، اور اس کی جلانے اور خاکستر کر دینے کی صلاحیت سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، لیکن غور کیا جائے تو انسان کے بے شمار مفادات آگ سے متعلق ہیں، یہ آگ ہی ہے جو نوع بہ نوع خوش ذائقہ غذائیں ہمارے لئے فراہم کرتی ہیں، آج جتنے کارخانے چل رہے ہیں، اور ایک سے ایک سہولت کی اشیاء ہمیں فراہم کر رہے ہیں، یہ سب آگ ہی کی کرشمہ سازی ہے، آگ سے بھاپ تیار ہوتا ہے، اور بھاپ سے مشینیں چلتی ہیں، لیکن قدرت کی دوسری نعمتوں کی طرح یہ نعمت بھی کبھی رحمت کے بجائے زحمت بن جاتی ہے، اگر کسی آبادی میں آتش فشاں پھوٹ جائے، تو انسان اور حیوان کیا، پہاڑ کی چٹانیں بھی سوکھے ہوئے تنکوں کی طرح فضاء میں بکھر جاتی ہیں، اور کسی آبادی میں آگ لگ جائے تو دیکھتے ہی دیکھتے پوری آبادی خاک بلکہ خاکستر کا ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ تو قدرتی آفات ہیں، لیکن اگر کوئی شخص اپنے آپ آگ کو ایک آفت بنالے، تو

اس سے زیادہ بے وقوف اور بدنصیب اور کون ہوگا؟ بعض لوگ تو غصہ یا مایوسی کی وجہ سے خودسوزی کر لیتے ہیں، دنیا میں بھی ان کی موت بڑی کربناک ہوتی ہے، اور آخرت میں خودکشی کا گناہ اس کے علاوہ ہے۔ جان کی طرح مال بھی اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے۔ مال نہ صرف دنیا میں انسان کے جینے کا سہارا اور اس کے بقاء کا ناگزیر ذریعہ ہے، بلکہ آخرت میں بھی اجر وثواب اور گناہوں کی تلافی کا باعث ہے، بہت سی عبادتیں جو فرض کی گئی ہیں، خالصاً مالی ہیں، صدقہ صرف عبادت ہی نہیں، بلکہ گناہ کے لئے کفارہ بھی ہے، مال ہی کے ذریعہ بہت سے حقوق وواجبات ادا ہوتے ہیں، جن کا ادا کرنا باعث ثواب اور جن سے غفلت برتنا باعث گناہ ہے۔

خودسوزی کے تو بہت سے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، لیکن مال سوزی اور اپنا مال آپ جلانے کے واقعات شاذ ونادر ہی پیش آتے ہیں، بلکہ اگر کوئی شخص اپنا مال آپ جلائے تو لوگ اسے پاگل اور دیوانہ ہی سمجھیں گے، لیکن مال سوزی کی کچھ ایسی صورتیں بھی ہیں جو ہیں تو پاگل پن ہی، لیکن معاشرہ انہیں پاگل پن نہیں کہتا۔ شادیوں میں جو پٹاخہ بازیاں ہوتی ہیں، کیا یہ اپنے پیسوں کو آپ جلانا نہیں ہے؟ شب برأت ایک مبارک رات ہے، عبادت اور ذکر وتلاوت کی رات ہے، لیکن کیا مسلمان ملکوں میں یہ رات پٹاخوں کی گھن گرج اور آتش بازیوں کی نذر کر دینے والی راتوں سے پہچانی جاتی ہے؟ ہندو بھائیوں کا ایک تیوہار دیپاولی ہے، پہلے اس رات تیل کے دیئے جلائے جاتے تھے، اس سے نہ گھر میں آگ لگتی تھی، نہ کسی کی جان کو خطرہ ہوتا تھا، نہ کمزور دل مریض کو کان پھاڑنے والی آواز سے گھبراہٹ ہوتی تھی، لیکن زمانہ کی ترقی کے ساتھ نئی نسلوں نے تیوہار منانے کے انداز بھی بدل لئے ہیں، اب مٹی کے دیوں کی جگہ بجلی کے بلب اور قمقموں نے لے لی ہے، اور آتش بازیاں اس جوش وخروش کے ساتھ ہوتی ہیں کہ گویا آگ کا کھیل ہے، کون کتنے روپے منٹ میں پھونک سکتا ہے؟ ہمارے مسلمان بھائیوں کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ اپنے غیر مسلم بھائیوں کے دکھ درد میں شریک ہوں، بھوکے ہوں تو انہیں کھانا کھلائیں، کپڑے نہ ہوں تو انہیں کپڑے پہنائیں، مریض ہوں تو ان کی عیادت کریں، لیکن دیوالی کے اس

نامعقول جوش وخروش اور آتش بازی میں وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، یعنی اجر و ثواب کے کام میں تو دوری اختیار کرتے ہیں، اور بارِ گناہ اٹھانے میں شریک و سہیم ہو جاتے ہیں۔

چراغاں اور آتش بازی بہ یک وقت کئی گناہوں کو شامل ہے، سب سے بڑا گناہ تو یہی ہے کہ یہ مال کا ضیاع ہے، آدمی اپنی ہر خواہش پوری کرنے لگے اور اس کے فوائد و نقصانات کو اپنے سامنے نہ رکھے، یہ بھی فضول خرچی میں داخل ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی ہر من چاہی چیز کھانے لگے، یہ بھی فضول خرچی ہے، ان من السرف ان تاکل کل ما اشتہیت (کنز العمال، حدیث: ۷۳۲۲۰) کھانا پینا اور لباس جو ایک ضرورت ہے، اس میں بھی آپ ﷺ نے اسراف کو پسند نہیں فرمایا، کلوا واشربوا و تصدقوا والبسوا مالم یخالطہ اسراف او مخیلۃ (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۶۰۵)

اسلام میں فضول خرچی کی ممانعت کے بارے میں احکام کس قدر سخت ہیں کہ وضوء جو ایک عبادت ہے، اور اس پر رسول اللہ ﷺ نے اجر و ثواب بتایا ہے، اس میں بھی ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرنے کو آپ ﷺ نے منع فرمایا اور اسی بنیاد پر فقہاء نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، آپ ﷺ کا معمول مبارک تھا کہ وضوء ایک مد اور غسل ایک صاع پانی سے کیا کرتے تھے، ایک صاع کا وزن ساڑھے تین کلو ہوتا ہے اور "مد" اس کا چوتھائی، اس سے آپ ﷺ کی کفایت شعاری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے آتش بازی کی وجہ سے لوگوں کا آرام و سکون غارت ہوتا ہے، راستہ چلنے والوں کو دقت پیش آتی ہے، بلکہ کئی ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ لوگوں کی جانیں تک چلی گئیں، یا بعض گھروں کو آگ لگ گئی، دوسروں کی ایذاء رسانی حرام اور گناہ شدید ہے، رسول اللہ ﷺ کو جب کسی گھر پر دستک دینا ہوتا تو ہتھیلیوں کے بجائے انگلیوں کے پوروں سے دستک دیتے، تا کہ بے ہنگم اور غیر متوازن آواز نہ ہو، آپ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا کہ کوئی ہتھیار لہرائے، کہ اس سے لوگوں کی ہراسانی ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ آتش بازی اور چراغاں بازی میں ایذاء رسانی بھی ہے اور ہراسانی بھی۔

تیسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ وہ دوسری قوموں کی مشابہت اختیار کریں، اور ان کے طور و طریق کو اپنائیں، خاص کر مذہبی معاملات میں دوسری اقوام کی مماثلت اختیار کرنا زیادہ باعث گناہ ہے، خوشی کے موقع پر اس طرح کی حرکتیں کرنا ہندو بھائیوں کی مشابہت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کسی قوم کا تشبہ اختیار کرے، وہ انہی میں سے ہے، من تشبه بقوم فهو منهم، مذہبی امور میں مشابہت کی ممانعت نسبتاً زیادہ ہے، بلکہ علماء نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔

جو فعل خود گناہ ہو، اس میں تعاون بھی گناہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ گناہ اور ظلم و زیادتی میں تعاون نہیں کرنا چاہئے "لا تعاونوا على الاثم والعدوان" (المائدۃ:۲) اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف خود پٹاخہ بازی کرنا ممنوع ہے، بلکہ دوسروں کو پٹاخہ فراہم کرنا یا اس کی دکانیں لگانا اور اس کو فروخت کرنا بھی اسی دائرہ میں آتا ہے، کیونکہ یہ سب گناہ کے تعاون میں شامل ہے۔

پھر مسلمانوں کے لئے لمحۂ فکر ہے کہ آپ ﷺ کا قبلۂ اول یہودیوں کے غاصبانہ تسلط میں ہے، آپ کی مسجدیں شہید کردی گئی ہیں، بوسنیا اور چیچنیا کی سرزمین آپ کے بھائیوں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے، گجرات کا لہو ابھی خشک بھی نہیں ہو پایا ہے، کیسی کیسی ذلت و نکبت اور پسپائی و ندامت ہماری تقدیر کا حصہ بنی ہوئی ہیں، ان حالات میں بھی اگر آپ خوشی کے شادیانے بجائیں، اور اظہار مسرت کے لئے آتش بازیاں کریں تو کیا ہم سے زیادہ بے حس اور بے شرم انسانیت کا کوئی اور گروہ ہوگا؟؟

(اکتوبر ۲۰۰۲ء)

رشوت ـــــ بڑھتا ہوا ناسور!

آج کل عہدے اور مناصب باعث اعزاز اور ذرائع کسب سمجھے جاتے ہیں، لیکن دراصل عہدہ داروں اور ذمہ داروں کی جواب دہی عام لوگوں کے مقابلہ زیادہ ہوتی ہے، وہ اپنے بارے میں بھی جواب دہ ہوتا ہے، اور اپنے ماتحتوں کے بارے میں بھی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ** یعنی تم میں سے ہر شخص اپنے دائرہ میں ذمہ دار ہے، اور جو لوگ اس کے ماتحت ہیں، وہ ان کے بارے میں جواب دہ بھی ہے، اس لئے جو لوگ کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوں، اور کوئی منصب ان سے متعلق ہو، ان کی زندگی کو زیادہ شفاف اور ان کے دامن عمل کو زیادہ پاک وصاف ہونا چاہئے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے سرکاری عاملین کو دیئے جانے والے ہدیہ کو بھی حرام قرار دیا، **ھدایا العمال غلول** (مجمع الزوائد ۴/۲۰۰)

اسی بناء پر فقہاء نے صراحت کی ہے کہ جو شخص قاضی بنایا جائے یا کسی اور سرکاری عہدہ پر فائز کیا جائے تو اسے ایسے لوگوں سے تحفہ قبول کرنا جائز نہیں، جو اس سے پہلے اسے تحائف پیش نہیں کیا کرتے تھے، یا پہلے کم یا معمولی تحفے دیتے تھے، اور اب ان کے تحائف کی مقدار اور معیار میں اضافہ ہو گیا ہو، کیونکہ تحفہ اپنے مقصد اور منشاء کے اعتبار سے رشوت ہوا کرتا ہے، اور اسی طرح خوبصورت ناموں کا غلاف چڑھا کر ایک ناپاک اور خبیث شئی کا لین دین عمل میں آتا ہے، رسول اللہ ﷺ جو حکیم وخبیر، انسانی نفسیات سے سب سے زیادہ باخبر اور حقیقت آگاہ تھے، آپ نے نہایت دقت نظر سے اس چھپی ہوئی انسانی بیماری کو شناخت فرمایا اور اس کے سدباب کے لئے یہ علاج تجویز کیا کہ سرکاری عہدہ دار رہتے ہوئے لوگ اسے جو کچھ دیں، وہ اسے بیت المال میں داخل کردے،

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ابن اتبیہ نامی قبیلہ بنو اسد کے ایک شخص کو وصولیٔ زکوٰۃ پر عامل بنایا، جب وہ صاحب واپس آئے تو عرض کیا کہ یہ آپ ﷺ کا ہے، اور یہ لوگوں نے مجھے ہدیہ کیا ہے، ھذا لکم و ھذا اھدی لی، تو آپ کو اس سے بہت تکلیف ہوئی، منبر شریف پر کھڑے ہوئے، اور لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم جب کسی شخص کو عامل بنا کر بھیجتے ہیں تو یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ آنے کے بعد کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے، وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں تو بیٹھ کر دیکھے کہ اسے ہدیہ کیا جاتا ہے یا نہیں؟ (بخاری، حدیث نمبر ۷۱۷۴) ایک موقع پر خاص اہتمام سے آپ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص میری جانب سے خدمت پر مامور ہو، اور وہ ہم سے ایک دھاگہ بھی چھپائے، تو وہ حرام ہے، جسے وہ قیامت کے دن لے کر آئے گا۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۵۸۱)

گویا حکمرانوں، قوم کے نمائندوں اور عہدیداروں کو مال کے معاملہ میں زیادہ محتاط کردار ادا کرنا ہے، کیونکہ جن عہدوں پر فائز کیا جاتا ہے، یہ کامل درجہ اعتماد اور ان کی دیانت پر پورے بھروسہ کی دلیل ہے، اگر وہی بے راہ روی کی راہ اختیار کرلے، اور خیانت کا ارتکاب کر بیٹھے، تو دوسروں پر کیا اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ اس احتیاط کی وجہ ظاہر ہے کہ قومی سرمایہ تک اس کی رسائی ہوتی ہے، وہ نہ صرف اپنا بلکہ پوری قوم کے مفادات کا محافظ اور چوکیدار ہوتا ہے اور اس پر جبر کرنے اور دوسروں کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی ان ہدایات اور اسلام کی ان تعلیمات کی اہمیت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ایوانِ اقتدار میں رشوت ستانی اور حریص سیاست دانوں کی قوم سے غداری کے واقعات منظرِ عام پر آتے ہیں۔

موجودہ بی جے پی حکومت اسی دعوے کے ساتھ برسرِ اقتدار آئی ہے کہ وہ ایک صاف شفاف اور رشوت خیانت سے پاک حکومت فراہم کرے گی، کانگریس کو وہ ہمیشہ صلواتیں سناتی رہتی ہے، اور بوفورس جیسی قد آور اور ہنگامہ خیز توپ پر بیٹھ کر اس نے اقتدار کا یہ سفر طے کیا ہے، اور اسی توپ سے کانگریس کے قلعہ کو مسمار کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، لیکن افسوس اور صد ہزار افسوس! کہ کانگریس تقریباً چالیس سال کے سیاسی سفر کے

بعد اسکینڈلوں کی جس قطار میں پارٹی تھی، بی جے پی کے اقتدار کو ابھی چالیس ہفتے
بھی نہیں ہوئے، لیکن اس نے بدعنوانی اور قوم سے خیانت میں اس پر بھی سبقت حاصل کر
لی ہے، گویا اقتدار میں سبقت کے ساتھ اخلاقی انحطاط میں بھی ہماری حکومت مسلسل
سبقت حاصل کر رہی ہے، اور یہ خیانت بھی دفاع جیسے اہم معاملے میں کی گئی ہے، جس
سے ملک کی سالمیت اور اس کے اقتدار کا تحفظ متعلق ہوتا ہے، پارٹی صدر جناب بنگارو لکشمن
سے لے کر بی، جے، پی کی سب سے اہم حلیف سمتا پارٹی کی صدر، جیا جیٹلی، ملک سے
وفاداری کے دعوے دار آر، ایس، ایس کے لیڈر جناب پنجابی، کئی فوجی جنرل، اور کئی صف اول
کے سیاسی قائدین اور دفاعی عہدیداران رشوت کے اس جرم کا کھلی آنکھوں میں ملوث پائے
گئے ہیں، جب اتنی ذمہ دار شخصیتیں اور اتنے اہم معاملہ میں خیانت اور بددیانتی کا ثبوت
دے سکتے ہیں تو اداروں کا کیا شمار؟؟

کہا جاتا ہے کہ حکمرانوں کے مزاج و اخلاق کا اثر ان کے زیر حکومت رہنے والوں
پر پڑتا ہے، الناس علی دین ملوکہم ہمارے ملک میں اس وقت قدم قدم پر رشوت
ستانی کا بازار جس طرح گرم ہے، وہ اس کی ایک روشن مثال ہے، آپ راستہ سے گذر
رہے ہیں تو ٹریفک پولیس کو "معمول" دینا ہے، کوئی معاملہ خدانخواستہ پولیس اسٹیشن کا
پیش آگیا تو ظالم کو سزا سے بچنے کے لئے اور مظلوم کو اپنی فریاد باقی رکھنے کے لئے معمول
دینا ضروری ہے، اگر آپ کی تجارت یا صنعت ہو تو "معمولات" کی ضرورت پڑے گی،
کچھ پولیس والے، کچھ ٹیکس والے، کچھ سیل ٹیکس آفیسر، کچھ دوا آفیسر، زمین و جائداد کا مسئلہ ہے تو
رجسٹری آفس کے کلرکوں اور ذمہ داروں کو معمول ادا کیجئے، اگر زمین میں آپ کا مد مقابل روشن
کنفرم نہیں، تو وہاں کی تی آپ سے معمول دینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کریں گے،
سیاست دانوں کا معاملہ ان سب سے سوا ہے، انہیں عوام سے ان کے کاموں کے لئے بھی
رشوت چاہئے اور جو سرکاری کام ان کی معرفت ہوتا ہے، ان میں بھی کمیشن چاہئے، ان کو تو
اس آمدنی کے بغیر شاید کھانا بھی ہضم نہ ہوتا ہو اور نیند بھی نہ آتی ہو، غرض، رشوت کا ایک
زنجیری حلقہ ہے، جس نے نیچے سے اوپر تک پورے سماج کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا

ہے، چونکہ اس حمام میں سب بے نقاب ہیں، اس لئے رشوت کا لین دین دوپہر کی دھوپ کی طرح معلوم و معروف ہے، لیکن مشکل ہی سے قانون کا شکنجہ انہیں کس پاتا ہے، جو کچھ ملتا ہے آپس میں بانٹ کر کھانے والے بیٹھے ہیں، اور وہ ایک دوسرے کو بچاتے ہیں، اسی میں اپنی عافیت محسوس کرتے ہیں، دوسرے یہ ہے کہ انسداد رشوت کے ذمہ داران بھی بعض دفعہ رشوت لینے کے مجرم پائے گئے ہیں، اس لئے رشوت جو پہلے چھپ چھپا کر لی جاتی تھی، لوگ شرماتے اور گھبراتے تھے کہ کہیں ان کی یہ کمزوری طشت از بام نہ ہو جائے، اب لوگ اسے کوئی قابل شرم بات نہیں سمجھتے ہیں، اور اس خلاف معمول کا نام ہی ''معمول'' پڑ گیا ہے، گویا یہ سماجی زندگی کے معمولات میں سے ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمان اور دیندار سمجھے جانے والوں کے ساتھ شرفاء بھی بے تکلف اس برائی میں مبتلا ہیں، اب صورت حال یہ ہے کہ بہت سے لوگوں سے ان کی آمدنی دریافت کی جائے تو کہتے ہیں کہ تنخواہ اتنی ہے، اور بالائی آمدنی اتنی، یا باہری آمدنی اتنی، یہ بھی بے حیائی اور بے شرمی کی انتہا ہے، کہ مجرم اپنے جرم کے اظہار میں بھی کوئی حیا محسوس نہ کریں، اور اپنی حرام خوری پر بھی اس قدر نازاں ہوں کہ اس ناجائز اور خبیث آمدنی کو بالائی آمدنی کا نام دیں، رسول اللہ ﷺ نے جن برائیوں پر لعنت فرمائی ہے، ان میں ایک رشوت کا لین دین بھی ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر لعنت فرمائی ہے، (ابوداؤد، ۳۵۸۰، ابن ماجہ، حدیث نمبر ۲۳۱۳) اور حضرت ثوبانؓ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ رشوت کے معاملہ میں جو دلال ہو یعنی جس نے دینے والے اور لینے والے کے درمیان واسطہ کا کام کیا ہے، اس پر بھی لعنت ہو: لعن رسول اللہ ﷺ الراشي والمرتشي والرائش (مجمع الزوائد ۴/۱۹۸) حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہے: الراشي والمرتشي في النار (مجمع الزوائد: ۴/۱۹۹) عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ فیصلہ میں رشوت کا لین دین تو کفر ہے، اور لوگوں کے درمیان رشوت ''سحت'' یعنی حرام کا کھانا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہماری تنخواہیں اتنی کم ہوتی ہیں کہ اوپر کی آمدنی کے بغیر ہماری گذر ہی نہیں ہوسکتی، لیکن یہ محض اپنے آپ اور اپنے خدا کے ساتھ دھوکہ ہے، بہت سے لوگوں کی آمدنی آپ سے کہیں معمولی اور حقیر ہے، لیکن انہوں نے اپنا دامن حرام سے بچا رکھا ہے، اگر کوئی اور مثال ملنی دشوار ہو تو ان موذنوں ہی کو دیکھ لیا جائے، جو مساجد اور مدارس میں مصروف خدمت ہیں، اور جن کو بہت سے لوگ نشۂ دولت میں مخمور ہو کر اپنی کم نگاہی کی وجہ سے حقیر سمجھتے ہیں، ان کی آمدنی کس قدر کم ہے، لیکن اس کے باوجود وہ حلال پر قناعت کے ساتھ خوش باشی اور بے فکری کے ساتھ اپنی زندگی گذار رہے ہیں۔

در اصل مال حلال میں برکت ہوتی ہے، اور مال حرام میں بے برکتی، برکت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہزار روپے بارہ سو روپے بن جائیں، اور بے برکتی کا یہ مطلب ہے کہ بارہ سو کے ایک ہزار ہو جائیں، برکت یہ ہے کہ جو کام دوسروں کا زیادہ پیسوں میں ہو، آپ کا وہی کام کم پیسوں میں ہو جائے، اور جن اخراجات طلب مصیبتوں میں دوسرا شخص مبتلا کیا جائے، اللہ آپ کو ان سے محفوظ رکھے، یہ برکت اور بے برکتی محض فلسفہ اور خیالی پلاؤ نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے انسان ہر روز سر کی آنکھوں سے دیکھتا اور عملی زندگی میں اس کا تجربہ کرتا ہے، دو شخص بیمار ہوئے، بیماری ایک ہی ہے، لیکن ایک کا علاج پچاس روپے میں ہوگیا، اور دوسرے کے علاج میں ہزاروں روپے خرچ ہوگئے، ایک نے اپنی لڑکی کی شادی کی تو لاکھوں خرچ ہوگئے، اور اس کے بھائی یا اس کے پڑوسی نے اپنی لڑکی کے لئے اسی معیار کا رشتہ کیا، اور دو ہزار میں پوری تقریب انجام پاگئی، اسی کا نام برکت ہے، اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کو ہر شخص اپنے ماحول میں دیکھ سکتا ہے، بس چشم بینا کی ضرورت ہے، اس طرح کے واقعات محض بخت و اتفاق نہیں، بلکہ اللہ کے نظام غیبی کے تابع ہیں۔

بعض لوگ ایسا سوچتے ہیں کہ جب سارا زمانہ اس برائی میں ملوث ہے تو ایک ہمارے احتیاط کرنے سے کیا انقلاب آجائے گا؟ یہ محض "عذر گناہ بدتر از گناہ" ہے، اگر کسی انسان کے جسم میں دس زخم ہوں تو کیا انسان یہ سوچ سکتا ہے کہ جسم کا جو تھوڑا حصہ باقی

رشوت اور ہمارا سماج

کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے، انسان تنہا نہیں رہ سکتا، انسانی آبادی ہی کے ذریعہ اس کی ضروریات پایۂ تکمیل کو پہونچ سکتی ہیں، اگر انسان کو خوبصورت سے خوبصورت بہشت صفت پارک میں بھی رکھ دیا جائے، اور اس میں نہرِ شیرِ رواں اور شہد کی نہریں بھی جاری ہو جائیں، لیکن وہ ویران اور غیر آباد ہو تو انسان جلد ہی اس خطۂ عشرت سے اکتا جائے گا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جنت میں بھی حضرت حوا کو حضرت آدم کا رفیق و شریک بنایا، اور دنیا میں نسل انسانی کے ہر فرد کو ایک پورے خاندان کی رفاقت عطا کی، جب ایک ہی جنس کے مختلف افراد جمع ہوں، تو ضروری ہے کہ ان کے مفادات میں ٹکراؤ ہو، یہ ٹکراؤ تین طرح کا رد عمل پیدا کرتا ہے: عدل، ایثار اور ظلم۔

عدل یہ ہے کہ ہر شخص قانون و اصول کے مطابق اپنے حق پر راضی اور قانع رہے، اگر تمام لوگ طے کر لیں کہ وہ اپنے حق پر ہی اکتفا کریں گے، تو ظاہر ہے کہ ان کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں پیدا ہوگا، جب ایک شخص اپنے حقوق کے دائرہ سے متجاوز ہو تو دوسرا فریق اپنے بھائی کے حق میں دست بردار ہو جائے گا، یہ نہایت اعلیٰ درجہ کا وصف ہے، اسی کا نام ایثار ہے، قرآن و حدیث میں اس وصف کی بڑی تحسین کی گئی ہے، ایثار تصادم کو ختم کرنے کا بہت ہی شریفانہ طریقہ ہے، لیکن نفس کے لئے اس قدر دشوار اور مشکل بھی ہے، اور بعض معاملات تو ایسے ہیں کہ ان میں ایثار کی گنجائش بھی نہیں ہے، اگر دوسرا فریق ایثار کے لئے تیار نہ ہو تو جو لوگ خدا ناترس ہوتے ہیں، وہ آمادۂ ظلم ہو جاتے ہیں اور دوسرے کا حق چھین لینے کی سعی نامسعود شروع کر دیتے ہیں، ظلم کے لئے جو اسباب اور وسائل اختیار کئے جاتے ہیں ان میں ایک اہم ذریعہ رشوت بھی ہے۔

کسی کو حق سے محروم کرنے یا کسی ناحق کو اپنے حق میں کرنے کے لئے جو پیسے، یا کوئی اور چیزیں دی جائیں اس کو رشوت کہتے ہیں ما یعطی لابطال حق او لاحقاق باطل (مجمع بحار الانوار ج ۲ ص ۲۸۷) ___ رشوت کے لئے صرف مال ہی کا استعمال نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات دوسرے مادی غیر مالی فوائد پہنچا کر بھی اپنے غلط مقاصد کو حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بھی رشوت ہی میں داخل ہے۔ رشوت معاشرہ میں ظلم و ناانصافی کو تقویت پہنچاتی ہے۔ رشوت کی وجہ سے باصلاحیت لوگ محروم کر دیئے جاتے ہیں، اور بے صلاحیت اور نااہل لوگ ذمہ دار بنائے جاتے ہیں، اور اس سے پورے سماج کو نقصان پہنچتا ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک طالب علم نے نااہلی کے باوجود رشوت دے کر ٹسٹ پاس کیا اور شعبۂ طب میں داخلہ لے لیا، پھر اسی طرح میڈیکل تعلیم مکمل کی، اس کے بعد اسی سہارے ملازمت حاصل کی، اور ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اب یہ نااہل کتنے مریضوں کو صحت کے بجائے موت سے ہم کنار کرے گا، اس نقصان کا اصل سرا رشوت ہی سے ملتا ہے۔ آج کل تو دفاع جیسے حساس اور اہم شعبہ میں بھی رشوت کا بازار گرم ہو گیا ہے، جس کے نقصانات کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، دفاع سے ملک کی سلامتی اور اس کا تحفظ متعلق ہے، اگر رشوت کی بنیاد پر غیر مفید ہتھیار خریدے گئے، تو خطرات کے مواقع پر کیسے ہم اپنی سرحدوں کی حفاظت کر سکیں گے؟ اس لئے رشوت فرد واشخاص، معاشرہ و سماج اور قوم و ملک ہر ایک کے لئے نہایت ہی نقصان دہ اور خطرناک عمل ہے۔

شاید ہی کوئی شخص ہو، جو رشوت کی برائی کا معترف نہ ہو لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج ہماری زندگی کا کوئی شعبہ رشوت ستانی سے خالی نہیں، اس نے باصلاحیت لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ یہاں تعلیم حاصل کریں، تجربے کریں اور اپنی قوم کو چھوڑ دوسرے ملکوں میں جا کر لوگوں کی خدمت کریں، اور کسی بھی شعبہ میں بے صلاحیت اور کم صلاحیت عہدہ داران اور کارکنان کی بھرمار ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ سرکاری، اسکولوں اور ہسپتالوں وغیرہ سے مایوس ہو گئے ہیں، اور کارکنوں کی نااہلی اور فرض ناشناسی کی وجہ سے دفتروں میں ہونے والے کام مہینوں میں بھی انجام نہیں پاتے۔

رشوت کو کسی بھی مذہب میں پسند نہیں کیا گیا ہے، اسلام کی نگاہ میں رشوت نہایت ہی قابل نفرت عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اپنے مال آپس میں باطل طریقہ پر نہ کھاؤ اور مال حکام کے پاس نہ لے جاؤ کہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ حالانکہ تم اس سے واقف ہو (البقرہ: ۱۸۸)

اس آیت میں خاص طور پر عدالت کی رشوت ستانی کی مذمت فرمائی گئی ہے، کیوں کہ عدالت کا کام ہی انصاف قائم کرنا اور ظلم کو روکنا ہے، اگر یہ ادارۂ انصاف خود رشوت کی بنیاد پر ظلم و ناانصافی پر عمل پیرا ہو جائے، تو اس سے زیادہ بدبختی کی بات اور کیا ہوگی، نمک اس لئے ہے کہ کھانے کے ذائقہ کو درست کرے، لیکن اگر نمک ہی خراب ہو جائے تو اس کا مداوا کیوں کر ہو سکے گا؟ شکر اس لئے ہے کہ بے مزہ چیزوں کو حلاوت بخشے، لیکن اگر شکر ہی میں حلاوت باقی نہ رہے، تو کہاں سے مٹھاس حاصل ہوگی؟ یہی حال عدالت اور انصاف کے اداروں کا ہے، اس لئے سب سے زیادہ مذموم اور ناپسندیدہ ترین صورت محکمۂ انصاف کا رشوت میں مبتلا ہونا، یا اس کو رشوت میں مبتلا کرنا ہے۔ ایک شخص وقتی طور پر اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن مآل کار یہی چیز خود اس کے لئے بھی موجب نقصان ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ جو شخص آج اس سے رشوت لے کر اپنے عہدہ کو بے آبرو کر سکتا ہے، وہ کل ہو کر اس کے خلاف دوسروں سے بھی رشوتیں وصول کر سکتا ہے۔

قرآن مجید نے رشوت کی دوسری جس بدترین صورت کا ذکر کیا ہے وہ ہے، دین و ایمان کے معاملہ میں رشوت، بہت سے یہودی اور نصرانی علماء اپنے خوش عقیدہ عوام سے نذر و نیاز وصول کیا کرتے تھے، اور دین کے بارے میں انہیں دھوکہ میں رکھتے تھے، جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت مبارکہ ہوئی، تو یہی لوگ اپنی عوام کو دامن اسلام میں آنے سے رکاوٹ بنے ہوئے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ وہ مسلمان نہ ہونے پائیں، تا کہ ان کی اس حرام خوری میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بدبختی سے پردہ اٹھاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اے ایمان والو! بہت سے یہودی اور عیسائی علماء ناحق طریقہ پر لوگوں کا مال کھاتے ہیں، اور اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں، جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، آپ انہیں دردناک عذاب کی "خوشخبری" سنا دیجئے۔ (التوبہ: ۳۴)

مذہب کی راہ سے جو رشوت آتی ہے، وہ تقدس کا لباس زیب تن کئے ہوئے ہوتی ہے، لوگوں کو اس کے رشوت ہونے کا خیال بھی نہیں ہوتا، اس مذہبی رشوت کی حقیقت جاننے کے لئے کلیساؤں کی تاریخ پڑھئے، جہاں مغفرت نامے فروخت کئے جاتے تھے، اور پادری حضرات ورثاء کے داد و دہش کے اعتبار سے میت کا درجہ و مقام متعین کر کے دستاویز بھی لکھ دیتے تھے، اسی کیفیت نے یورپ میں کلیسا کے خلاف بغاوت پیدا کی اور بالآخر یہ عیسائیت کے بجائے نفس مذہب سے نفرت کا باعث ہوا، مدینہ میں علماء یہود حلال و حرام کے احکام متعین کرنے میں بھی رشوت لیا کرتے تھے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ مفتی پر حسب خواہ فتویٰ لکھنے کے لئے پیسے قبول کرنا بھی حرام ہے، اور یہ بھی رشوت میں داخل ہے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ مستفتی سے کسی قسم کا تحفہ قبول ہی نہ کیا جائے، بعض فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے۔

مذہبی رشوت کی روایت آج بھی ختم نہیں ہوئی ہے، قادیانی حضرات کے یہاں آج بھی بہشتی مقبرہ، قادیان میں اصل اور دوسرے مقامات پر اس کی نقل کی شکل میں موجود ہیں، جس میں کثیر رقم لے کر تدفین کی اجازت دی جاتی ہے، اور لوگ اس تصور کے ساتھ اس میں دفن ہوتے ہیں کہ یہاں دفن ہوتے ہی اب وہ داخل بہشت ہوں گے، اسی تصور کے تحت دور دراز مرنے والے اپنی جائیداد کا ایک بڑا حصہ دے کر اس قبرستان میں جگہ حاصل کرتے ہیں، یہ مغفرت نامے تقسیم کرنے کی جدید اور مہذب شکل ہے، افسوس کہ اب مسلمانوں میں بھی یہ بیماری در آئی ہے، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر فلاں بزرگ کی قبر کے قریب دفن ہونے کا موقع مل جائے تو ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا، حالانکہ انسان کا مسئلہ عقیدہ و عمل اور تعلق مع اللہ سے حل ہوگا، نہ کہ کسی مخصوص جگہ میں دفن ہونے سے، عوام

کی اس خوش عقیدگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ، بہت سی دفعہ متولیان خطیر رقم حاصل کر کے قبر کی جگہ دیتے ہیں ، یہ بالکل خلاف شرع بات ہے ، کیوں کہ قبرستان وقف ہے ، وقف کی زمین کا کوئی شخص مالک نہیں ہو سکتا ، اور نہ ہی اسے خرید و فروخت کیا جا سکتا ہے ، یہ غیر شرعی عمل بھی رشوت ہی کے دائرہ میں آتا ہے ۔

رشوت کی ان دو صورتوں کو تو قرآن نے صراحتاً ذکر کیا ہے ، لیکن رشوت جس شعبہ میں بھی ہو اس کا محرک کچھ بھی ہو اور کسی نام سے بھی لین دین ہو یہ بہر حال حرام ہے ، رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے ۔
(ترمذی بروایت عبد اللہ بن عمرو ، حدیث نمبر : ۱۳۳۷)

رشوت لینا تو جرم ہے ہی ، لیکن رشوت دینا بھی کچھ کم جرم نہیں ، کیوں کہ جب معاشرہ میں رشوت دینے والے لوگ پیدا ہوتے ہیں تبھی رشوت خوروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور ان کے مرض کو تقویت پہونچتی ہے ، حضرت ثوبان ؓ کی ایک روایت میں "رائش" کے لفظ کا اضافہ ہے ، (مجمع الزوائد : ۱۹۸/۴) رائش "بیچ" کو کہتے ہیں ، یعنی جو شخص رشوت خور اور رشوت دہندہ کے درمیان واسطہ کا کردار ادا کرے ۔

بحیثیت عہدہ جو فریضہ آپ سے متعلق ہے ، اگر اس کے ادا کرنے پر آپ نے پیسے حاصل کئے ، خواہ منہ کھول کر مانگا ہو ، یا زبان حال کو سمجھتے ہوئے دیا گیا ہو ، بہر صورت یہ رشوت میں داخل ہے ، رشوت نام بدل کر بھی دی جاتی ہے ، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عہدہ داروں کو دیا جانے والا تحفہ بھی غلول اور حرام ہے ، ھدایا العمال غلول (مجمع الزوائد : ۲۰۰/۴) بعض لوگ رشوت کے لئے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ سماج کا حال ہی بگڑا ہوا ہے ، اور تمام ہی لوگ رشوت خوری کرتے ہیں ، یہ نفس کو فریب دینے کا ایک بہانہ ہے ، نہ کہ دلیل ، اگر کوئی برائی اس لئے جائز ٹھہرے کہ بہت سے لوگ اس کا ارتکاب کرتے ہیں تو پھر تو کوئی برائی ، برائی نہ ہوگی کہ اس کو سند جواز حاصل نہ ہو جائے ، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے سماج میں اب بھی بہت سے ایسے ایماندار لوگ موجود ہیں ، جو رشوت سے اپنا دامن بچاتے ہیں ، اور خوبصورت پیشکشوں اور فلک بوس ایوانوں کے مالک

سود اور ہمارا معاشرہ

اسلام کے نظام معیشت کا ایک بنیادی ستون ''سود'' کی ممانعت ہے، یوں تو اسلام سے پہلے بھی اکثر مذاہب میں سود کو منع کیا گیا تھا، بائبل کا عہد عتیق جو یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کے نزدیک مستند ہے، کے ''خروج'' نامی صحیفہ میں اسرائیلیوں سے سود لینے کو منع کیا گیا ہے، اور عہد جدید جو صرف عیسائیوں کے نزدیک معتبر ہے، کے صحیفہ ''لوقا'' کی انجیل میں بھی قرض پر نفع نہ لینے کی تلقین کی گئی ہے، بلکہ عیسائیت میں اصلاحی تحریک کے بانی لوتھر نے تو اس بات کو بھی شدومد سے منع کیا اور حرام قرار دیا کہ نقد قیمت کے مقابلہ ادھار قیمت زیادہ رکھی جائے، فلاسفۂ یونان افلاطون اور ارسطو وغیرہ نے بھی سود کو ایک نامعقول اور ایک ناواجبی فعل قرار دیا ہے، کیونکہ خود روپیہ میں روپیہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں۔

لیکن اسلام نے جس شدت و تاکید کے ساتھ اس سے منع کیا ہے کسی اور مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی، قرآن مجید میں کئی آیات میں صراحتاً سود کو منع کیا گیا ہے، اور یہاں تک فرمایا گیا کہ اگر تم سود سے باز نہ آئے تو خدا اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ (البقرۃ: ۲۷۹) احادیث میں بھی بکثرت سود کی مذمت کی گئی ہے، آپ ﷺ نے سود لینے والے، سود دینے والے، سودی معاملہ کو لکھنے والے اور اس معاملہ پر گواہ بننے والے، سبھوں پر اللہ کی لعنت بھیجی ہے۔ (مسلم، عن جابر بن عبداللہ) ایک روایت میں ہے کہ سود کا وبال ستر قسم کا ہے، جن میں سے کمتر درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے۔ (مستدرک حاکم، عن عبداللہ ابن مسعود) حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا کہ سود کا ایک درہم تینتیس بار زنا کرنے سے بڑھ کر ہے۔ (طبرانی) آپ ﷺ کے ارشادات

سے معلوم ہوتا ہے کہ سود ان برائیوں میں سے ہے جس کی وجہ سے دنیا میں بھی عذاب آتا ہے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب کسی آبادی میں زنا اور سود کی کثرت ہو جائے تو گویا اس آبادی والوں نے اپنے اوپر اللہ کے عذاب کو اتار دیا (مستدرک حاکم) اور ایک روایت میں ہے کہ جب کسی قوم میں سود عام ہو جاتا ہے تو وہ قوم قحط سالی میں مبتلا کر دی جاتی ہے (مسند احمد عن عمرو بن عاص)

بظاہر یوں لگتا ہے کہ سود سے مال بڑھتا ہے، لیکن درحقیقت سود سے بے برکتی پیدا ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں" (البقرۃ ۲۷۶) نیز حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے آپ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ جس نے سود سے بہت سارا مال بنایا، انجام کار اس میں کمی ہی ہوگی، (ابن ماجہ) اسی لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ سود سے بھی بچو اور شبہ سود سے بھی بچو "دعوا الربو والریبۃ" (ابن ماجہ)

ایک طرف سود کی یہ دنیوی مضرت ہے کہ شاید شرک کے علاوہ کسی اور برائی کی اس درجہ مذمت نہ کی گئی ہو، جس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی بھی ہے کہ قیامت کے قریب سود، زنا اور شراب نوشی عام ہو جائے گی، (طبرانی عن عبداللہ بن مسعودؓ) ایک روایت میں ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اگر کوئی شخص سود خوری سے بچ بھی جائے تو اس کے غبار سے نہیں بچ سکے گا (ابوداؤد عن ابی ہریرۃؓ) اور غالباً یہ زمانہ آ چکا ہے!

سود کی حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی جنس کی چیزوں کا تبادلہ ہو، جیسے روپیہ کا روپیہ سے، سونا کا سونا سے، چاول کا چاول سے، اور ایک طرف سے زیادہ مقدار ہو اور دوسری طرف سے کم، جیسے ایک سو روپیہ دیا جائے اور ایک سو دس وصول کیا جائے، یا ایک سو کیلو چاول دیا جائے اور ایک سو دس کیلو چاول وصول کیا جائے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ایک اصول مقرر فرما دیا کہ قرض پر قرض دہندہ کو کسی بھی طرح کا نفع حاصل کرنا سود میں داخل ہے: "کل قرض جر منفعۃ فھو ربو" (الجامع الصغیر عن علیؓ) صحابہؓ اس معاملہ میں اس قدر محتاط تھے کہ مقروض کا تحفہ بھی قبول کرنے میں احتیاط کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے حضرت ابی ابن کعبؓ کو دس ہزار درہم بطور قرض دیئے تھے، حضرت ابی ابن کعبؓ

نے اپنے باغ کا کچھ پھل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تحفہ پیش کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واپس کر دیا۔ (بخاری، مسلم) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر تم کسی کو قرض دو اور وہ تم کو کھانے کا طبق پیش کرے، یا اپنی سواری پر چڑھائے، اور پہلے سے اس طرح کے تحفے تحائف دینے کا اس کا معمول نہ رہا ہو تو ایسے تحائف قبول نہ کرنا چاہئے۔ (ابن ماجہ) حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میں نے ایک شخص کو قرض دیا اور اس نے مجھے کچھ تحفہ دیا تو حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا تو اس تحفہ کے بدلے میں تحفہ دے دو یا اس کو اپنے قرض میں شمار کر لو۔ (مصنف عبدالرزاق) اس لئے قرض دینے والوں کو اس سلسلہ میں خوب احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

افسوس کہ آج کل سود کی حرمت اور شناعت لوگوں کے ذہن سے نکلتی جا رہی ہے، بہت سے لوگ بات تو جائز اور حلال منافع کی کرتے ہیں لیکن نقصان کا خطرہ قبول کرنے کو بالکل تیار نہیں ہوتے اور چاہتے ہیں کہ ان کا نفع بہرحال متعین رہے۔ وہ سرمایہ کو کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔ یہ خالص سود خواروں کی ذہنیت کی علامت ہے۔ جہاں یہ بات ضروری ہے کہ اپنا سرمایہ خوب سوچ سمجھ کر کسی کمپنی میں مشغول کیا جائے اور کمپنی کے کاروبار کی پہلے تحقیق کر لی جائے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ایک مسلمان اپنے ذہن کو اس بات کے لئے تیار رکھے کہ اگر اللہ کی طرف سے اس کے لئے نقصان ہی مقدر ہے تو اسے بھی وہ کس خوشی برداشت کرے گا۔

سود کی بعض ایسی صورتیں بھی ہیں، جس میں ناواقفیت کی وجہ سے بعض دیندار لوگ بھی مبتلا ہو جاتے ہیں، ان میں ایک صورت تو بینک میں فکسڈ ڈپازٹ کی ہے، یعنی آپ ایک مخصوص مدت کے لئے بینک میں اپنی رقم رکھتے ہیں، وہ اس مدت کے پوری ہونے پر بینک دو گنی تین گنی صورت میں یہ رقم آپ کو واپس کرتا ہے، ظاہر ہے یہ صورت صریحاً سود کے دائرہ میں آتی ہے اللہ تعالیٰ نے مطلقاً سود کو حرام قرار دیا ہے، کسی خاص خطہ اور علاقہ کی قید نہیں لگائی، اس لئے جیسے شراب، زنا، چوری اور ڈکیتی مسلم ممالک میں بھی حرام ہیں اور غیر مسلم ممالک میں بھی، اسی طرح سود کی ممانعت بھی ہر علاقہ اور مقام کے لئے ہے اور

اس سے بچنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔

آج کل شہروں میں یہ صورت مروج ہے کہ لوگ اپنا مکان ایک مخصوص مدت کے لئے فروخت کر دیتے ہیں، کہ جب بھی ہم یہ رقم واپس کر دیں، پھر مکان واپس مل جائے گا۔ مثلاً "الف" نے "ب" کے ہاتھ پچاس ہزار میں مکان فروخت کیا کہ جب بھی الف ب کو پچاس ہزار روپیہ ادا کر دے گا ب اس کو اس کا مکان واپس کر دے گا۔ اس معاملے میں الفاظ تو خرید وفروخت کے استعمال کئے جاتے ہیں، لیکن حقیقت میں اس رقم کی حیثیت قرض کی ہے اور مکان بطور رہن کے قرض دینے والے کے پاس ہے، رہن کے سامان سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں، کیوں کہ یہ قرض پر نفع اٹھانا ہے اور قرض پر نفع اٹھانا سود میں داخل ہے۔ فقہاء کے نزدیک یہی صحیح رائے ہے۔ اسی طرح دیہاتوں میں مقروض اپنی زرعی اراضی قرض دہندہ کو حوالہ کرتا ہے کہ جب تک وہ قرض ادا نہ کر دے قرض دہندہ اس کی پیداوار لیتا رہے، یہ صورت بھی سود میں داخل ہے، کیوں کہ یہ قرض پر نفع اٹھانا ہے اور اسی کا نام سود ہے۔

بعض ادارے جن کا مقصود غیر سودی قرضوں کی فراہمی ہے وہ دفتری اخراجات اور ادارہ کے انتظامات کے لئے قرض لینے والوں سے کچھ رقم وصول کرتے ہیں، اگر ہر ماہ حساب ہو جائے اور واقعی جتنی رقم قرض کے لین دین کو لکھنے والے عملہ اور قرض وصول کرنے والے عاملین پر خرچ ہوئی ہے، اس کو ان مقروضوں پر ان کے قرض کی نسبت سے تقسیم کر دیا جائے اور ٹھیک اتنا ہی پیسہ وصول کیا جائے تو اس کی گنجائش ہے، لیکن مقروضوں پر ان کی رقم کے تناسب سے ماہانہ فیس رکھی جائے یا فیصد، مثلاً ہزار روپے پر پانچ روپے ماہانہ یا بیس ہزار پر بیس روپے ماہانہ، تو یہ صورت جائز نہیں ہے اور یہ بھی سود ہی میں داخل ہے، اسی طرح قرض کے تناسب سے قرض فارم فروخت کرنا، مثلاً دس ہزار روپیہ قرض لینے والوں کو سو روپے کا قرض فارم اور بیس ہزار روپیہ قرض لینے والوں کو دو سو روپے کا قرض فارم خریدنے پر مجبور کرنا جائز نہیں، یہ صورت بھی سود میں داخل ہے، جو ادارے قائم ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ لوگوں کو غیر سودی قرضے فراہم کریں ان کے لئے ایسے طریقے

اختیار کرنا قطعاً مناسب نہیں، جو خود یا بالواسطہ سود کے زمرہ میں آتے ہیں۔

چٹھی فنڈ کی یہ صورت کہ ماہ بہ ماہ ایک شخص پوری رقم اٹھا لے، اور تمام شرکاء کو باری باری برابر رقم ادا کرنی پڑے، جائز ہے، لیکن یہ صورت کہ بعض شرکاء نقصان کے ساتھ چٹھی اٹھا لیں، جائز نہیں، اور سود میں داخل ہے؛ کیوں کہ یہ رقم کا رقم سے تبادلہ ہے اور بعض شرکاء کو زیادہ رقم حاصل ہوتی ہے اور بعض کو کم ___ اسی طرح تاجروں کے حلقہ میں چیک، ڈرافٹ اور کسی کے ذمہ واجب الاداء قرض کم قیمت میں فروخت کیا جاتا ہے تا کہ کم سے کم نقد رقم حاصل ہو جائے، مثلاً دس ہزار کا چیک نو ہزار میں فروخت کر دیا جاتا ہے، یہ صورت بھی سود ہی کی ہے، اور قطعاً جائز نہیں۔

اسی طرح کے بعض اور معاملات بھی ہیں جو سود سے خالی نہیں، ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ دنیا حلال و حرام کی پرواہ کئے بغیر جس راستہ پر جا رہی ہے ہم بھی وہی راستہ اختیار نہ کر لیں، بلکہ اپنے آپ کو سود جیسے گناہ سے بچائیں، کہ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کا گوشت مال حرام سے پیدا ہوا ہو، جہنم اس کی زیادہ مستحق ہے۔ (مشکوۃ:۲۴۲)

(۹/اپریل/۱۹۹۹ء)

منشیات بڑھتا ہوا سماجی ناسور

انسان کو جن نعمتوں سے سرفراز کیا گیا ہے، ان میں ایک عقل و دانائی بھی ہے، یہی عقل ہے جس نے اس کے کمزور ہاتھوں میں پوری کائنات کو مسخر کر رکھا ہے اور اسی صلاحیت کی وجہ سے اللہ نے اس کو دنیا میں خلافت کی ذمہ داری سونپی ہے، اسی لئے اسلام میں عقل کو بڑی اہمیت حاصل ہے، قرآن مجید نے بے شمار مواقع پر مسلمانوں کو تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، تدبر اور تفکر کی حقیقت کیا ہے؟ یہی کہ انسان جن چیزوں کا مشاہدہ کرے، اور جو کچھ سنے اور جانے عقل کو استعمال کرتے اس میں غور و فکر کرے، اور انجانی حقیقتوں اور ان دیکھی سچائیوں کو جاننے اور سمجھنے کی سعی کرے، اسی لئے قانون اسلامی کے ماہرین اور فلاسفہ نے لکھا ہے کہ شریعت کے تمام احکام بنیادی طور پر پانچ مقاصد پر مبنی ہیں، دین کی حفاظت، جان کی حفاظت، نسل کی حفاظت، مال کی حفاظت اور عقل کی حفاظت، گویا عقل اور فکر و نظر کی قوت کو برقرار رکھنا اور اسے خلل اور نقصان سے محفوظ رکھنا اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔

چنانچہ اسلام میں جن کاموں کی شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اور جن سے منع فرمایا گیا ہے ان میں ایک نشہ کا استعمال بھی ہے، قرآن مجید نے نہ صرف یہ کہ اس کو حرام بلکہ ناپاک قرار دیا ہے، کیونکہ انسان کا سب سے اصل جوہر اس کے اخلاق و کردار ہیں نشہ انسان کو اخلاقی پاکیزگی سے محروم کر کے گندے افعال اور ناپاک حرکتوں کا مرتکب کرتی ہے، اور انسان کی روحانی اور باطنی ناپاکی ظاہری ناپاکی سے بھی زیادہ انسان کے لئے مضرت رساں ہے، احادیث میں بھی اس کی بڑی سخت وعید آئی ہے، اور بار بار آپ ﷺ نے پوری صفائی اور وضاحت کے ساتھ اس کے

حرام اور گناہ ہونے کو بتایا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے، (بخاری عن عائشہ، حدیث نمبر ۵۵۸۵) حضرت جابر بن عبداللہ سے آپ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ جس شئی کی زیادہ مقدار نشہ کا باعث ہو اس کی کم مقدار بھی حرام ہے (ترمذی، حدیث نمبر ۱۸۶۵) یہ نہایت اہم بات ہے، کیونکہ عام طور پر نشہ کی عادت اسی طرح ہوتی ہے کہ معمولی مقدار سے انسان شروع کرتا ہے اور آگے بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ زہر آمیز انجکشن کے بغیر اس کی تسکین نہیں ہوتی۔

نشہ کے جو نقصانات ہیں وہ ظاہر ہیں، اس کا سب سے بڑا نقصان تو خود اس شخص کی صحت کو پہنچتا ہے، اطباء اس بات پر متفق ہیں کہ شراب اور منشیات ایک سست رفتار زہر ہے، جو آہستہ آہستہ انسان کے جسم کو کھوکھلا اور عمر کو کم کرتا جاتا ہے، انسان کی زندگی اس کے لئے ایک امانت ہے، انسان کے وجود سے نہ صرف اس کے بلکہ سماج کے بہت سے لوگوں کے حقوق بھی متعلق ہیں، نشہ کا استعمال اس امانت میں خیانت کرنے کے مترادف ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے نشہ آور اشیاء کے ساتھ ساتھ ایسی چیزوں سے بھی منع فرمایا جو جسم کے لئے "فتور" کا باعث بنتی ہوں یعنی ان سے صحت میں خلل واقع ہوتا ہو، چنانچہ حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے: نهى رسول الله عن كل مسكر و مفتر (ابوداؤد، حدیث نمبر ۳۶۸۶)

منشیات کے نقصانات کا دوسرا پہلو مالی ہے، سیال منشیات ہوں یا جامد، قابل لحاظ قیمت کی حامل ہوتی ہیں، شراب کی ایک بوتل اتنی قیمتی ہوتی ہے کہ خط غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کا ایک کنبہ اس سے اپنی ایک وقت کی روٹی روزی کا سامان کر لیتا ہے، یہ تو معمولی نشہ آور اشیاء کا حال ہے، بعض منشیات تو اتنی قیمتی ہیں کہ ایک کیلو کی قیمت ایک کروڑ روپے ہوتی ہے، ہماری حکومت ایک مملوک کے لئے ایک لاکھ روپے ایکس گریشیا دیتی ہے، اس طرح آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک کیلو ہیروئن کی قیمت ایک سو انسانوں کے برابر ہے، اس سے ہمارے عہد میں انسانی وجود کی ناقدری اور صحت و

اخلاق کے لئے مخرب اشیاء کی "قدر و قیمت" کا تعقل کر سکتے ہیں!

— پھر منشیات کا استعمال تو آدمی اپنے اختیار سے شروع کرتا ہے، لیکن جب وہ گرفتار بلا ہو جاتا ہے تو آپ اپنے قابو میں نہیں رہتا، وہ اضطراراً منشیات کے خریدنے اور استعمال کرنے پر گویا مجبور ہوتا ہے، چاہے کھانے کو دو روٹی میسر نہ ہو، گھر کے لوگ بھوک اور فاقہ سے گذار رہے ہوں، علاج کے لئے پیسے میسر نہ ہوں لیکن جو اس عادت کا اسیر ہو گا، وہ انسانی ضروریات کو پس پشت ڈال کر پہلے اپنی اس خوئے بد کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا، اس لئے اسراف اور فضول خرچی کا یہ بہت بڑا محرک ہے، نشہ خواری نے خاندان کے خاندان کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، بڑی بڑی جائدادیں اور پرشکوہ حویلیاں اس خود خریدہ زہر کے عوض کوڑی کی قیمت بک چکیں۔

منشیات کی مضرتوں کا سماجی پہلو یہ ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے جس سے مختلف لوگوں کے حقوق اور ذمہ داریاں متعلق ہیں، ایک شخص باپ ہے تو اسے اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت کرنی ہے، نہ صرف اس کے روز مرہ کی کھانے پینے کی ضروریات کو پورا کرنا ہے، بلکہ اس کی تعلیم کی بھی فکر کرنی ہے، وہ بیٹا ہے تو اسے اپنے بوڑھے ماں باپ اور اگر خاندان کے دوسرے بزرگ موجود ہوں تو ان کی پرورش کا بار بھی اٹھانا ہے، شوہر ہے تو یقیناً بیوی کے حقوق اس سے متعلق ہیں، بھائی ہے تو چھوٹے بھائی بہنوں کی پرورش اور شادی بیاہ کا فریضہ اسی کے کاندھوں پر ہے، نشہ انسان کو اپنے گرد و پیش سے بے خبر اور غافل بنا دیتا ہے، اور اس بدمستی میں نہ اس کو لوگوں کے حقوق یاد رہتے ہیں، نہ اپنے فرائض و واجبات، بعض اوقات تو وہ ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے کہ اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی بھی تباہ و برباد کر دے، جیسے طلاق کے واقعات ہیں، طلاق کے بہت سے واقعات بالخصوص دیہی علاقوں میں اسی نوعیت کے ہوتے ہیں، جس کا خمیازہ اسے بھی بھگتنا پڑتا ہے اور اس سے زیادہ اس کی بیوی اور بچوں کو۔

شراب کے نقصانات کا سب سے اہم پہلو اخلاقی ہے، نشہ کی بدمستی انسان سے ناکردنی کرا لیتی ہے، اور ناگفتنی کہلوا دیتی ہے، قتل، عصمت ریزی، ظلم و زیادتی سب و شتم

اور بدزبانی، کوئی باعزت لوگوں کی بے توقیری، کون سی بات ہے جو انسان نشہ کی حالت میں نہ کرتا ہو؟ ہوش کی کیفیت میں جس سے آنکھ ملانے کی بھی جرأت نہیں ہوتی، نشہ کی حالت میں اس پر ہاتھ اٹھا دینا بھی قابل تعجب نہیں، اور معتدل حالت میں تنہائی میں بھی زبان پر جن باتوں کا لانا گراں خاطر ہو نشہ کی حالت میں اس سے زیادہ فحش اور خباثت آمیز تکلم انسان بے تکلف کرتا ہے، اسی لئے نشہ صرف برائی ہی نہیں، بلکہ برائیوں کی جڑ ہے، اور محض ایک گناہ ہی نہیں بلکہ سینکڑوں گناہوں کا سرچشمہ ہے۔

اسی لئے پیغمبر اسلام ﷺ نے شراب کو ''ام الخبائث'' یعنی برائیوں کی جڑ (نسائی: ۵۶۶۹) اور ''ام الفواحش'' یعنی بے حیائیوں کی جڑ قرار دیا ہے، (ابن ماجہ: ۳۳۷۲) شراب کی اخلاقی قباحتوں کی اس سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی، ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ جیسے درخت سے شاخیں پھوٹتی ہیں، اسی طرح شراب سے برائیاں۔

آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی بیان فرمایا کہ ایک خوبصورت عورت نے اپنے پاس شراب رکھی اور ایک بچہ کو رکھا اور ایک شخص کو مجبور کیا کہ وہ تین میں سے ایک برائی کم سے کم ضرور کرے، یا تو وہ اس عورت کے ساتھ بدکاری کرے، یا اس بچہ کو قتل کردے، یا شراب پیئے، اس شخص نے سوچا کہ شراب پینا ان تینوں میں کمتر ہے، چنانچہ اس نے شراب پی لی، لیکن اس شراب نے بالآخر یہ دونوں گناہ بھی اس سے کرالئے۔ (نسائی: ۵۶۶۶)

غرض نشہ جسمانی، مالی، سماجی اور اخلاقی ہر پہلو سے انتہائی مضرت رساں چیز ہے، اس وقت نوع بنوع نشیات کی کثرت اور اس کے استعمال میں جو عموم پیدا ہو رہا ہے وہ صد درجہ تشویش ناک بات ہے، لوگوں نے منشیات کو نئے نئے خوبصورت نام دے دئے ہیں، گٹکے، چاکلیٹ اور مختلف دوسری اشیاء کے ساتھ نشہ کا نام لئے بغیر تھوڑا تھوڑا نشہ آور اجزاء کا طلب اور نوجوانوں کو عادی بنایا جاتا ہے، اور یہی چیز ان کو آئندہ منشیات کا باضابطہ خوگر بنا دیتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے خوب ارشاد فرمایا کہ میری امت میں بعض لوگ

شراب پئیں گے لیکن اس کو شراب کا نام نہیں دیں گے، یسمونها بغیر اسمها (نسائی ۵۶۵۸) نیز حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ جس نے کسی کم عمر لڑکے کو شراب پلائی جس کو حلال وحرام کا شعور نہیں، تو اللہ پر ضروری ہے کہ قیامت کے دن اسے پلائے
(مجمع الفوائد ۳: ۲۷۰)

مغربی ملکوں میں شراب کی کثرت کی ایک اہم وجہ خاندانی نظام کا بکھراؤ بھی ہے، خاندانی روابط کے کمزور پڑ جانے اور رشتوں کے بکھر جانے کے باعث لوگ اپنی نجی زندگی میں ذہنی اور قلبی سکون سے محروم ہیں، اس لئے چند ساعت کے سکون کے لئے نشہ کرتے ہیں کہ کچھ تو قلب کا بوجھ ہلکا ہو، مشرقی معاشرہ میں زیادہ تر یہ چیز بغیر سمجھے بوجھے مغرب کی نقل اور فیشن کی دین ہے، اب جرائم پیشہ اور مافیا گروہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو نشہ کا عادی بنا کر ان کا استحصال کرتا ہے، ان کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے آلۂ کار بناتا ہے اور ان سے نشہ کی تھوڑی مقدار کے عوض قتل وراہزنی، چوری اور عصمت فروشی کے کام لیتا ہے، تعلیم گاہوں میں منشیات کا بڑھتا ہوا رجحان ستم بالائے ستم، اور نقصان بالائے نقصان کا مصداق ہے۔

اس برائی سے سماج کو بچانے کی تدبیر یہی ہے کہ ایک طرف لوگوں کو نشہ کے نقصانات کے بارے میں باشعور کیا جائے اور اس کے نقصانات سے بر سطح پر آگاہ کیا جائے، دوسری طرف ان اسباب پر روک لگائی جائے جو منشیات کے پھیلنے میں مدد معاون ہیں، اگر شراب پینے کے پرمٹ بھی جاری کئے جائیں اور دوسری طرف شراب سے منع بھی کیا جائے تو یہ تو ایک مذاق ہوگا جہاں قدم قدم پر شراب کی دکانیں کھلی ہوں، ہوٹلوں میں شراب بیچی، خریدی جاتی ہو، سرکاری تقریبات میں جام وسبو پیش کئے جاتے ہوں، وہاں شراب کی برائی کیوں کر لوگوں کے ذہن میں راسخ ہو سکے گی، اور کیسے سماج کو اس لعنت سے نجات حاصل ہوگی؟ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے شراب کے سلسلہ میں دس آدمیوں پر لعنت بھیجی ہے، نچوڑنے والے پر، نچوڑوانے والے پر، پینے والے پر، اٹھا کر لے جانے والے پر، اس پر جس کی طرف اٹھا کر لے جائی جائے۔

ساقی ہے، بیچنے والے پر اس کی قیمت لوٹانے والے پر شریعت نے ڈالی ہے اور ایسا شخص ہے جس کے لئے بد دعا کی گئی ہے (ترمذی، حدیث ۱۲۶۵) اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہوگی کہ ملک کے عوام اور ارباب اقتدار اس کی مضرتوں سے واقف ہیں پھر بھی اس لئے اس پر پابندی لگانے کے حق میں نہیں کہ اس تجارت سے حکومت کو اپنی [illegible] اور ارباب اقتدار کو اپنی عشرت کوشیوں کے لئے ڈھیر سارا ٹیکس وصول ہو سکتا ہے؟؟

{۲۳ر جولائی ۱۹۹۶ء}

کردار کشی

الیکشن کا طوفان تھم چکا ہے، اور ہندوستان کے آٹھ علاقوں میں الیکشن کا عمل پورا ہو چکا ہے، الیکشن کے نتائج ابھی تک مشین میں بند ہیں، اور بڑے بڑے امیدواروں کی قسمتیں ان بند ڈبوں سے متعلق ہیں، یہ الیکشن صرف سیاسی زور آزمائی اور عوامی مقبولیت ہی کی آزمائش نہیں، بلکہ ہمارے اخلاق و کردار، زبان و بیان اور شرافت کا بھی امتحان ہیں، ہندوستان کی ایک امتیازی شناخت ہے، جو شروع سے مذہبی و تہذیبی رنگا رنگی میں ممتاز رہی ہے، بودھ مذہب ہو یا جین مت، ایران سے آیا ہوا پارسی مذہب ہو، یا خود ہندوستان میں پیدا ہونے والا سکھ دھرم، ہندو مذہب ہو یا حق و سچائی کا آخری اور مکمل ترجمان مذہب اسلام، ان سب کے متبعین اس ملک کے چپے چپے پر بستے ہیں، اور یہاں کی تہذیب و ثقافت ان سب کے اثرات سے خالی نہیں ہے، مذہب خواہ کوئی بھی ہو، وہ عقیدہ و عمل میں خواہ کتنا بھی اختلاف رکھتا ہو، شرافت، اخلاق اور انسانیت کا پیغامبر ہوتا ہے، اسی لئے رواداری، مروت اور ہمدردی ہندوستان کی اصل فطرت ہے، اگر اس ملک کی فطرت میں یہ عنصر نہ ہوتا تو مختلف قوموں کو یہاں پناہ نہ ملی ہوتی، اور یہ تہذیبوں اور قوموں کا گلدستہ نہ ہوتا۔

لیکن کیا ہم نے اپنی اس قومی روایت کو باقی رکھا ہے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ایسی چیز ہے کہ آپ اپنا امتحان خود لیں اور خود اپنا احتساب کریں، جب حالات معتدل ہوں، اس وقت انسان کے اخلاق اور سلوک کی آزمائش نہیں ہوتی، انسان غیر معمولی حالات ہی میں پہچانا جاتا ہے، الیکشن بھی آزمائش کی گھڑی ہے، یہ موقع مفادات کے ٹکراؤ اور نظریات کے تصادم اور ہندوستان کی سیاست میں مختلف طبقات کے باہمی اقتدار کا ہوتا ہے، اس موقع سے ہمارے اخلاق کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے، اور فرقہ وارانہ جذبات اپنی

چڑھتے ہیں، اخلاق وانسانیت کے مصنوعی نقاب جو ہم نے پہن رکھے ہیں، تار تار ہو جاتے ہیں، اور اس کے اندر جو مکروہ چہرہ چھپا ہوا ہے، وہ سامنے آ جاتا ہے۔

پچھلے دنوں ہمارے سیاسی قائدین نے کیا کچھ نہیں کہا، اور نہیں کہلایا؟ بی جے پی لیڈروں نے محترمہ سونیا گاندھی کے خلاف کیسے اوچھے ریمارک کئے، اور پھر کانگریس کے جنرل سکریٹری نے اٹل بہاری واجپئی وزیر اعظم پر کیسے ناشائستہ جوابی حملے کئے؟ ملک کی بعض دوسری خواتین امیدواروں پر بھی اخبار کی دنیا میں ایسی پھبتیاں کسی گئیں کہ شریف آدمی تنہائی میں بھی ان کو کہنے سے شرمائے، خود ہمارے مسلمان قائدین نے ایک دوسرے کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہا؟ تقریروں میں ایک دوسرے کے نجی حالات بلکہ اس کی کئی پشتوں کے حالات بیان نہیں کئے گئے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایک دوسرے کی عزت و آبرو کو بھی نشانہ بنایا گیا؟ یہ ہماری اخلاقی پستی اور فکری دناءت کا مظہر ہے، اپنے نظریات کو پیش کرنا اور مخالف نقطہ نظر پر تنقید کرنا بری بات نہیں، بلکہ جمہوریت کا ضروری حصہ ہے، معیاری تنقید سے بڑھ کر جمہوریت کے لئے کوئی قیمتی تحفہ نہیں ہو سکتا، لیکن ضروری ہے کہ تنقید ہو تنقیص نہیں، اور تنقید ادب و شائستگی کے دائرہ میں ہو۔

جب نفس پر چوٹ پڑے اور اپنے کردار کو ٹھوکر لگے، وہی وقت انسان کے اخلاقی معیار کو پرکھنے کا ہوتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بہادر وہ نہیں جو کشتی میں کسی کو زیر کردے بلکہ حقیقی بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے، انما الشدید الذی یملک نفسہ عند الغضب (بخاری، حدیث نمبر: ۶۱۱۴، مسلم، حدیث نمبر: ۲۶۰۹)

ایک بار ایک صاحب نے آپ ﷺ سے نصیحت کرنے کی خواہش کی، آپ نے ارشاد فرمایا: لا تغضب یعنی غصہ نہ کرو، وہ بار بار آپ ﷺ نصیحت کی خواہش کرتے رہے اور آپ ہر بار یہی ارشاد فرماتے کہ غصہ نہ کرو، (بخاری، حدیث نمبر ۶۱۱۶، ترمذی حدیث نمبر: ۲۰۲۰)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ ایک بار آپ ﷺ نے عصر کے بعد صحابہؓ سے خطاب فرمایا، آپ ﷺ نے اس خطاب میں یہ بھی فرمایا کہ مزاج کے اعتبار سے انسان مختلف نوع کے ہوتے ہیں، ان میں سب سے بہتر وہ ہے جس کو غصہ دیر سے آئے اور جلد

بچا جائے۔ خیرھم بطیء الغضب و سریع الفیء اور سب سے خراب شخص وہ ہے جس کو غصہ آئے جلدی اور جائے دیر سے۔ (ترمذی، حدیث نمبر ۲۱۹۱) اس لئے انفرادی معاملات میں بھی اور اجتماعی مسائل میں اس سے بھی بڑھ کر غیظ و غضب کو قابو میں رکھنا چاہئے کہ حد اعتدال سے بڑھتا ہوا غصہ، نفرت اور حسد کے جذبے کی زبان کو بے قابو کرتا ہے اور غیر معتدل بنا دیتا ہے۔

نرم خوئی اور نرم کلامی سے وہ کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے، جو تند مزاجی یا درشت خوئی اور کڑواہٹ سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نرم خو ہیں، نرم خوئی کو پسند فرماتے ہیں اور نرم خوئی پر وہ کچھ عنایت کرتے ہیں جو تند خوئی پر نہیں دیتے، ان اللہ رفیق یحب الرفق، و یعطی علی الرفق ما لا یعطی علی العنف (مسلم، حدیث نمبر ۲۵۹۳) آپ ﷺ نے خوب ارشاد فرمایا کہ نرمی جس چیز میں بھی ہو اسے آراستہ اور خوبصورت بنا دے گی، ان الرفق لا یکون فی شیء الا زانہ اور جو چیز نرمی سے محروم ہوگی وہ بدنمائی سے خالی نہ ہوگی، ولا ینزع من شیء الا شانہ (مسلم، حدیث نمبر ۲۵۹۴) اس لئے تنقید جس سے خیر اور تعمیری ہو، شریفانہ لب و لہجہ اور حدود ادب میں ہو، تو ایک بہتر چیز ہے، لیکن اگر تنقید کا مقصد کردار کشی اور ذاتیات پر حملہ کرنا ہو، تو یہ نہایت قبیح، غیر اصلاحی اور غیر شریفانہ عمل ہے۔

آپ ﷺ کے مخالفین اور کفار و مشرکین آپ کو "محمد" کی بجائے "مذمم" کہا کرتے تھے، "محمد" (ﷺ) کے معنی قابل تعریف کے ہیں، "مذمم" کے معنی ایسے شخص کے ہیں، جس کی برائی بیان کی جاتی ہو، یہ حق سے عناد اور ناشائستہ حرکت تھی، وہ ظاہر ہے، لیکن آپ ﷺ مجسم رحمت تھے، اس سے بھی آپ مشتعل نہیں ہوئے، اور نہ اپنے مخالفین کو بھی قبیح ناموں سے یاد کیا، بلکہ صحابہؓ کو اقارب کی اس حرکت پر غصہ آتا تو تسلی دیتے، اور فرماتے اللہ نے ان کی لعنت و ملامت کو میری طرف سے پھیر دیا ہے، کہ وہ "مذمم" کو برا بھلا کہتے ہیں اور میں "محمد" ہوں۔ (بخاری، حدیث نمبر ۳۵۳۳) حدیث میں کہیں یہ بات نہیں ملتی کہ آپ ﷺ نے اپنے بدترین مخالفین کے لئے بھی ناشائستہ الفاظ استعمال کئے ہوں، یا ان کی

ذاتی زندگی کے مفاسد کو طشت ازبام کرنے کی کوشش کی ہو۔

آپ ﷺ غیر مہذب کا جواب بھی مہذب طریقے پر دیا کرتے تھے، یہود ہمیشہ آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے رہتے تھے، اور ایسے الفاظ کی تلاش میں رہتے تھے جس کے خراب معنی ہوں، اور وہ لفظی اور صوتی اعتبار سے کسی اچھے لفظ کے قریب ہو، تاکہ دھوکہ دیا جاسکے، چنانچہ سلام سے قریبی لفظ عربی میں "سام" ہے، جس کے معنی موت کے ہیں، جب آپ کو سلام کرتے تو "السلام علیکم" کی بجائے "السام علیکم" کہہ دیتے، جس کے معنی ہیں: "آپ ﷺ پر موت آئے" آپ ﷺ اس کے جواب میں صرف "وعلیکم" کہنے پر اکتفا کرتے، ایک بار کچھ یہود ملاقات کو آئے اور انہوں نے اسی طرح کے الفاظ کہے، حضرت عائشہؓ موجود تھیں، ان سے رہا نہیں گیا، اور جواب دیا: "بل علیکم السام واللعنة" یعنی تم پر موت آئے اور لعنت ہو، آپ ﷺ نے فرمایا کہ عائشہ! تم بدزبان نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کو ہر معاملے میں نرمی پسند ہے۔ ان اللہ یحب الرفق فی الامر کلہ۔ (بخاری، باب النہی عن ابتداء اہل الکتاب بالسلام الخ)

قرآن مجید نے حضرت موسیٰ کی دعوتی زندگی کا بہت تفصیلی نقشہ کھینچا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون کی طرف دعوتِ اسلام دینے کے لئے مامور فرماتے ہیں، فرعون کی سنگ دلی، اس کا ظلم و جور، کفر پر اس کا اصرار، بلکہ اپنی خدائی کا دعویٰ محتاجِ اظہار نہیں، لیکن اس کے باوجود حکم ہوا کہ ان کو نرمی کے ساتھ دعوت دینا شاید اسے عبرت ہو اور اس میں خدا کا خوف پیدا ہو: "فقولا له قولا لينا لعله يتذكر أو يخشى" مقامِ غور ہے! کہ فرعون جیسے ظالم و جابر اور متکبر کافر کے ساتھ بھی نرم گفتاری کی تلقین کی جارہی ہے، قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ خدا کے نیک بندوں کا طریقہ یہ ہے کہ ان کی چال ڈھال بھی تواضع اور فروتنی کا مظہر ہوتی ہے، اور جب اوچھے قسم کے لوگ ان سے ناشائستہ باتیں کہتے ہیں تو وہاں سے بھی کلمۂ خیر کہہ کر ہٹ جاتے ہیں: "واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما" (الفرقان۔۶۳)

رسول اللہ ﷺ کے یہاں عزتِ نفس کا اس درجہ خیال تھا کہ غیر مسلموں میں بھی جو اصحاب وجاہت ہوتے، آپ ﷺ ان کا لحاظ فرماتے، آپ ﷺ نے بادشاہ روم ہرقل کو خط لکھا تو "عظیم الروم" کے لفظ سے خطاب فرمایا، یعنی روم کا عظیم شخص، بعض صحابہ کو اس تعبیر پر تامل تھا، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو اسی طرح کہتے ہیں، بعض سرداران قبائل کو از راہِ احترام آپ ﷺ نے اپنا تکیہ پیش فرمایا، ابو سفیان اہل مکہ کے سردار تھے، فتح مکہ کے موقع سے آپ ﷺ نے ان کا اعزاز کرتے ہوئے فرمایا: جو ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسے امن ہے، "من دخل دار ابی سفیان فهو آمن" یہ آپ ﷺ کا سلوک و برتاؤ غیر مسلموں اور اعداءِ اسلام کے ساتھ تھا، اور ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ بھی ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جس پر انسانیت شرمائے، اور جس سے شرم وحیا کو عار آئے۔

یہ کردار کشی جو اسٹیج پر ہوتی ہے، اور پوسٹر اور اخباری اشتہار کو بھی اس کے لئے ذریعہ ووسیلہ بنایا جاتا ہے اور سوال وجواب، پھر جواب الجواب اور اس کے بعد اس جواب کا جواب جو کیا جاتا ہے اور لوگوں کی عزت وآبرو سے کھیلنے میں جس چابکدستی اور مہارت کا ثبوت دیا جاتا ہے، وہ مسلمانوں کے لئے سراسر باعث شرم وعار ہے، باہمی کردار کشی اور آبرو ریزی کے بغیر بھی ہم اپنا مدعیٰ لوگوں کے سامنے رکھ سکتے ہیں، اور ہم اپنا پیغام پہنچا سکتے ہیں، ہماری یہ اخلاقی پستی اور دناءت عام مسلمانوں کو غلط اشارے دیتی ہے، جب مسلمانوں کے قائدین اور محترم شخصیتیں ہی اس سطح پر اتر آئیں تو عوام سے کیوں کر توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان کمزوریوں سے دور رکھ سکیں گے؟ جس سفینہ کا ناخدا ہی آدابِ سفر سے بے بہرہ ہو، کون ہے جو اسے ساحل سے ہمکنار کرے؟ — کاش! ہمارے سیاسی قائدین اور ان قائدین کے معاونین وانصار جو بہرحال اسی "خیر امت" ہی کا ایک حصہ ہیں، اس حقیقت پر غور کریں!

(۱۷ر ستمبر ۱۹۹۹ء)

پانی جس نے آگ لگادی

پانی کا کام آگ بجھانا اور ٹھنڈک پہنچانا ہے، لیکن اس وقت ''پانی'' نے پورے ملک میں آگ لگا رکھی ہے، قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کون سا آتش خیز اور حرارت ریز پانی ہے؟ میری مراد ''Water'' نامی فلم سے ہے! جسے دیپا مہتا نامی ہدایت کار بنا رہی ہیں، اس سے پہلے ان ہی خاتون نے ''آگ'' لگائی تھی، اور ''آگ'' نامی فلم تیار کی تھی، شعبہ سینما کے کارکن اس فلم پر اتنے برہم ہوئے کہ حقیقی معنوں میں کرتے پاجامے سے باہر آگئے، اور اب وہ ایسا پانی پیش کر رہی ہیں جو آگ سے بھی بڑھ کر گرم ہے: ''فائر'' نامی فلم ہم جنسی کے موضوع پر تھی، ظاہر ہے کہ یہ بے حیائی اور بے شرمی پر مبنی فلم ہے، ہندوستان جیسے ملک میں جو بڑی حد تک ایسی اخلاقی بیماریوں سے پاک اور محفوظ ہے، وہاں ہم جنسی کے موضوع پر کسی فلم کا آنا ایک بے معنی بات ہے، اور اس کا نتیجہ برائی کی تشہیر و ترغیب کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

دیپا مہتا کی نئی فلم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہندو مذہبی طبقہ میں پھیلی ہوئی اخلاقی ابتری اور ہندو معاشرہ میں خواتین بالخصوص بیوہ خواتین کے ساتھ ناروا سلوک اور ان کی حالت زار کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہیں: اول یہ کہ جو باتیں اس کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہیں کیا وہ حقائق پر مبنی ہیں؟ دوسرے اگر حقائق پر مبنی ہیں تو کیا ہر حقیقت کا اظہار مناسب ہوتا ہے، اس سے قطع نظر کر اس سچائی کا اظہار سماج کے لئے مفید ہے یا مضر، اور فائدہ مند ہے یا نقصان دہ؟؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو مذہبی مصادر میں اخلاقی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض باتیں بکثرت پائی جاتی ہیں، رام جی ہندوؤں کے یہاں نہایت ہی مقدس شخصیت بھی

جاتی ہے۔ اور اس وقت تو ''رام'' کا نام ہندو فکر و تہذیب کا عنوان بن چکا ہے۔ لیکن رامائن رام کی زبان میں سیتا کے حسن کی جو تصویر کھینچتا ہے وہ کھلی ہوئی بے حیائی پر مبنی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی لکشمن کے سامنے سیتا کے ساتھ اپنے جنسی تعلقات کو بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ لنگ اور یونی مردانہ اور زنانہ اعضائے مخصوصہ کو کہا جاتا ہے، ہندو مذہب میں لنگ اور یونی کی بھی پرستش کی جاتی ہے، یہاں تک کہ ان فحش الفاظ سے بچوں کے نام بھی رکھے جاتے ہیں، جیسے شیولنگم، رام لنگم وغیرہ، کرناٹک میں بعض مندر ایسے ہیں جہاں مرد و عورت کو بے لباس ہو کر پوجا کرنی پڑتی ہے، حکومت اسے روکنے کی کوشش کر رہی ہے، لیکن اکثر حکومت کی ممانعت پر مذہبی جذبات غالب آ جاتے ہیں۔

اسی لئے ہندو مذہبی حلقہ میں مرد و عورت کے جنسی تعلق کے طریقے اور کیفیات تحقیق و تالیف کا خاص موضوع ہے، اور اس موضوع پر ''کام سوتر'' کے نام سے کئی مذہبی کتابیں او بش قسم کے لوگوں کے لئے لذت کام و دہن کا سامان ہیں، بے حیائی اور بد اخلاقی کو مذہبی رنگ دینے کے لئے برہمنوں نے ''دیوداسی نظام'' شروع کیا، اس رسم کے تحت عام ہندو اور خاص کر نچلی ذات کے لوگ اپنی لڑکیوں کو مندروں پر مذہبی جذبہ سے وقف کیا کرتے تھے، اور لوگوں کو دھوکہ دے کر مذہبی شخصیتیں ان سے اپنی شہوات پوری کیا کرتے تھے، مسلمانوں کے دور حکومت میں اس نامعقول رسم کو ختم کرنے کی بہت کچھ کوششیں کی گئیں، لیکن بدقسمتی سے اب تک ہمارا شہر کرناٹک اور ہندوستان کے بعض علاقوں میں یہ رسم باقی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ''دیوداسی نظام'' کو اگر مذہبی قحبہ گری کا عنوان دیا جائے تو غلط نہ ہوگا!

چنانچہ اس مذہبی فکر نے ہندو تمدن پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے، ''کھجوراہو'' کا مندر اور ''اجنتا'' کے غار اس کی کھلی ہوئی مثالیں ہیں، جیسا کہ کہنے والے کہتے اور نقل کرنے والے نقل کرتے ہیں کہ کوئی شریف اور حیادار انسان اپنے بزرگوں یا عزیزوں کے ساتھ ان مناظر کو دیکھ نہیں سکتا، ہندو تحریکات پر بھی دقتاً فوقتاً بے حیائی کی چھاپ نمایاں رہی ہے، اس کی واضح مثال اچاریہ رجنیش اور ''برہما کماری تحریک'' ہے، اس

لئے یہ ایک تلخ حقیقت اور کڑوی سچائی ہے کہ ہندو مذہب کی جو تصویر اس وقت ہمارے سامنے ہے وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے کسی مذہب کے شایانِ شان نہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ یہ مذہب کی حقیقی تعلیمات میں آمیزشوں اور ملاوٹوں کا نتیجہ ہے، ورنہ کسی مذہب کے بارے میں ایسی حیا باختہ فکر کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ہندو سماج میں عورتوں کی مظلومیت بھی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں، منوسمرتی عورتوں کے بارے میں صاف کہتی ہے کہ کسی عورت پر بھی بھروسہ مت کرو، کسی بھی عورت کے ساتھ تنہا مت بیٹھو خواہ وہ تمہاری ماں ہو، یا بیٹی یا بہن، وہ آپ کو غلط ترغیب دے سکتی ہے، اسے شوہر سے علاحدگی کا حق نہیں، نہ ہندو مذہب میں اس کے لئے میراث ہے، نہ وہ اپنے لئے رشتہ منتخب کر سکتی ہے، بیوہ عورتیں منحوس سمجھی جاتی ہیں، وہ دوسری شادی نہیں کر سکتیں، ان کو زندگی بھر بیٹا و سنگار سے دور رہنا ہے، اور سب سے بڑا ظلم ستی کی رسم ہے، ہندو عقیدہ کے مطابق ایک عورت کے ستی ہونے کی وجہ سے تین خاندان کے گناہ معاف ہوتے ہیں، اس کے والد کا خاندان، اس کی والدہ کا خاندان، اور اس کے شوہر کا خاندان، اس ترقی یافتہ دور میں بھی ستی کی وکالت کرنے والے لوگ موجود ہیں، پوری کے شنکر اچاریہ نے علی الاعلان کہا ہے کہ بیوہ عورت کے لئے ستی ہونے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں، اور حکومت کے ذریعہ اس رسم پر پابندی لگائے جانے کی وہ پوری قوت سے مخالفت کریں گے، خواہ انہیں پھانسی پر کیوں نہ چڑھا دیا جائے، جب ان سے پوچھا گیا کہ ایسی خواتین کے بچوں کا کیا ہوگا؟ تو بے تکلف جواب دیا کہ یہ تقدیر کا لکھا ہے، بچے خواہ تکلیف اٹھائیں یا مر جائیں، ستی بہر حال ہندو مذہب میں جاری رکھی جائے گی، جب ہندو مذہب کے سب سے بڑے پیشوا ستی کے وکیل و نقیب ہوں تو اگر روپ کنور یا ان جیسی دوسری بھولی بھالی خواتین کے ستی ہونے کا واقعہ پیش آئے تو تعجب نہ ہونا چاہئے!

اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اخلاقی بے راہ روی اور عورتوں کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی ہندو سماج میں موجود ہے، اور سب سے بڑی عجیب بات یہ ہے کہ اس کو

مذہبی رنگ دے دیا گیا ہے، یہ کہنا تو بہر حال صحیح نہ ہوگا کہ ہندوستان کی تمام مذہبی شخصیتوں کے بارے میں یہ رائے قائم کر لی جائے کہ وہ سب ایسی باتوں میں برابر کے شریک ہیں، یقیناً ان میں شریف، سنجیدہ اور تقاضۂ حیا سے آگاہ اور انسانی نجابت کی ترجمان شخصیتیں بھی ہوں گی، اور ان سب کے بارے میں ایک ہی طرح کا خیال قائم کر لینا شاید قرین انصاف نہ ہو، ___ لیکن سوال یہ ہے کہ کہاں پر سچائی کا اعلان واظہار کیا جانا چاہئے؟ غالباً اس کا جواب نفی میں ہے۔

ایسی سچائی جو سماج کو فائدہ کی بجائے نقصان پہونچائے، جو خیر کی اشاعت کی بجائے بدی کی تشہیر کا باعث ہو، جو لوگوں کو شرافت وصالحیت کی بجائے بدخوئی کی طرف لے جاتی ہو، اس سچائی کو ظاہر کرنے سے چھپانا بہتر ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے بعض مواقع پر جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے، کیوں کہ یہاں جھوٹ بہ مقابلہ سچ کے زیادہ مفید اور نفع بخش ہے، اگر ایک مظلوم اور کمزور شخص نے آپ کے یہاں پناہ لے رکھی ہے، ایک بے بس عورت اپنی عصمت وعزت کی حفاظت کے لئے چھپی ہوئی ہے، اور ایک ظالم اس مظلوم کے قتل اور ایک اوباش اس عورت کی عصمت ریزی کے درپے ہو اور آپ کے جھوٹ سے اس شخص کی جان اور اس عورت کی عزت بچ سکتی ہو، اور آپ کے سچ سے جان جا سکتی ہو اور ایک عورت کی حیا وعفت تار تار ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ضرورت ہے کہ ان حالات میں آپ کے لئے جھوٹ بولنا ہی واجب ہے، اور سچ بولنا اس جرم میں شریک ہونے کے مترادف ہے۔

فلم خواہ کوئی بھی ہو اسلامی نقطۂ نظر سے وہ گناہ ہی ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فلم بنیادی طور پر برائی کی ترویج اور سفلی جذبات کی تحریک ہی کا ذریعہ ہے، اس سے کسی خیر کی توقع نہیں، لیکن ایسی فلمیں جن کا مقصد شروع سے اخیر تک نفسانی جذبات کی تسکین ہی ہو، جس کا منشا برائی کی خاص طور پر تشہیر ہو اور جو مذہبی جذبات کے احترام اور تقدس کی حدود کو بھی مجروح کرتی ہو یقیناً شر بالائے شر اور گناہ بر تر از گناہ ہے، ممکن ہے کہ سنگھ پریوار کے لوگ اس لئے اس فلم کی مخالفت کر رہے ہوں کہ اس سے برہمنی افکار وتصورات پر زد

ہوتی ہے، اور ہندو تمدن کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے، لیکن اس سے قطع نظر تمام ہی سنجیدہ لوگوں کے لئے یہ اور اس طرح کی فلمیں قابلِ مذمت ہیں کہ ایک تو اس سے بے حیائی کی اشاعت ہوتی ہے، دوسرے اس سے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی نہایت ہی ناشائستہ اور غلط روایت قائم ہورہی ہے، جو بڑے فساد اور انتشار کا موجب بن سکتا ہے، قرآن مجید نے تو اس پہلو کو اس قدر ملحوظ رکھا ہے کہ شرک سے بڑھ کر اسلام میں کوئی شی قابلِ مذمت نہیں لیکن مشرکین جن دیویوں، دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہوں، ان کو برا بھلا کہنے سے بھی منع کیا گیا کہ ہر انسان کے لئے اپنے مذہب پر رہتے ہوئے دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱۱ر فروری ۲۰۰۰ء)

افواہیں اور ہمارا رویہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کی صلاحیتوں کو محدود رکھا ہے، اس کی قوتیں ایک خاص دائرہ میں کام کرتی ہیں، مثلاً انسان کو ایک بہت بڑی نعمت دیکھنے کی دی گئی ہے، پتھر اور لوہے کس قدر مضبوط ہیں، سمندر کا دامن کس قدر وسیع اور بے پناہ ہے، لیکن ہم دیکھ نہیں سکتے۔ انہوں نے آج تک خود اپنے حسن و جمال کو بھی دیکھا نہیں ہوگا، لیکن ایک خاص حد تک چیزوں ہی کو انسان دیکھ سکتا ہے، اگر کوئی رکاوٹ نہ بھی ہو تو انسان کو آدھے ایک کیلومیٹر سے آگے کی چیزیں صاف نظر نہیں آتیں، اگر بیچ میں دیوار حائل ہو تو بالکل قریب کی چیزوں کو بھی وہ نہیں دیکھ سکتا، انسان میں سننے کی صلاحیت رکھی گئی ہے، لیکن اس کا بھی یہی حال ہے، اس کی سماعت کا دائرہ چند فرلانگ تک ہوتا ہے، یہ بھی اس وقت ہے کہ جب کہ کوئی چیز حائل نہ ہو، ورنہ دو کمروں کے بیچ چند انچ کی دیوار ہوتی ہے اور ایک طرف کی آواز دوسری طرف بالکل سنائی نہیں پڑتی، انسان کے دیکھنے اور سننے کے دائرہ کو جو محدود رکھا گیا ہے بظاہر یہ ایک محرومی معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں یہ بجائے خود اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، ہر انسان اپنے لئے ایسی تنہائی (Privacy) چاہتا ہے جو دوسرے کی مداخلت سے آزاد ہو، انسان کی بہت سی ضروریات ایسی ہیں، جن میں دوسروں کی آنکھ اور کان کے تعاقب سے باہر ہونا، اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے، فرض کیجئے کہ کسی مکان میں بہت سے کمرے ہوں، ہر کمرے میں الگ الگ لوگ رہتے ہوں، وہ سب ہر وقت ایک دوسرے کی نظر میں ہوں اور ایک دوسرے کی چھوٹی بڑی بات کانوں سے ٹکراتی رہتی ہو تو اس کے لئے زندگی گزارنا کتنا دوبھر ہو جائے گا، اسے اپنے مکان میں رہتے ہوئے بھی ایسا محسوس ہوگا کہ وہ ہر لمحہ کسی معروف پلیٹ فارم

پر منحصر ہے، اس لئے انسان کی صلاحیتوں کا محدود ہونا بظاہر ایک کمزوری معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور انسان کے لئے سامان راحت بلکہ ایک ضرورت ہے۔

انسان اپنی محدود دیکھنے اور سننے کی صلاحیت کی وجہ سے بہت سی باتیں جاننے کے لئے دوسروں کی اطلاع کا محتاج ہوتا ہے، اس کے سوا چارہ نہیں کہ اپنے چشم سر سے دیکھے اور گوش سر سے سنے بغیر بعض امور کو تسلیم کرے، اس لئے دنیا کا سارا کاروبار دوسروں کی دی ہوئی خبر پر اعتماد و یقین سے متعلق ہے، اور اسی طرح نظام زندگی جاری و ساری ہے، خبریں صحیح بھی ہوتی ہیں اور غلط بھی، سچی بھی ہوتی ہیں اور جھوٹی بھی، خبر دینے والے جھوٹے بھی ہوتے ہیں، بعض لوگ بظاہر سچے ہوتے ہیں لیکن ان کی طبیعت میں مبالغہ ہوتا ہے، وہ لفظوں کے ایسے بازیگر ہوتے ہیں کہ سننے والوں کو رائی پہاڑ محسوس ہوتا ہے، کچھ لوگ شریف اور نیک خو ہوتے ہیں، لیکن سادہ لوح اور بھولے بھالے ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی باتوں کا یقین کر لیتے ہیں، کسی خبر پر تحقیق نہیں کرتے، اور اس کے کھرے کھوٹے کو پرکھے بغیر مان لیتے ہیں، بعض حضرات سے کسی بات کو سننے یا سمجھنے میں غلط فہمی بھی ہو جاتی ہے، یہ مختلف اسباب ہیں جن کی وجہ سے دانستہ یا نادانستہ طور پر بلا دلیل یا ارادہ خلاف واقعہ باتیں لوگوں میں چل پڑتی ہیں، ایسے ہی بے سروپا باتوں کو "افواہ" کہتے ہیں۔

بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص نے کچھ لوگوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا، یہ دوڑ بھاگ کسی اور سبب سے تھی، لیکن شہر کی فضا کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کو خیال ہو گیا کہ شاید دو گروہوں کے درمیان تصادم ہو گیا ہے، اب اس خوف سے انہوں نے خود بھاگنا شروع کیا، آتے ہوئے راستہ میں جو لوگ ملے ہمدردی و خیر خواہی میں انہیں بھی واپس ہونے کی صلاح دے دی، پھر خبر ایک محلہ سے دوسرے محلہ میں پہونچی، اور ایک فرقے کے کچھ لوگوں نے دوسرے فرقہ کے لوگوں پر دھاوا بول دیا یہاں تک کہ پورا شہر فساد کی آگ میں بھڑکنے لگا، اور اس بے تحقیق خبر کی چنگاری نے پورے علاقہ کے امن وامان کو نذر آتش

کر دیا۔ اس طرح کے واقعات ہمارے معاشرے میں پیش آتے رہتے ہیں۔ افواہوں کی بنا پر گروہی لڑائیاں ٹھن جاتی ہیں، ادارے اور جماعتیں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اتحاد کی صفوں میں رخنہ پڑتا ہے، خاندانوں میں نفرت کی آگ سلگ جاتی ہے، بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ میاں بیوی میں طلاق کے واقعات پیش آ جاتے ہیں، والدین، اولاد اور قریب ترین اقارب کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ افواہوں کے گرم بازاری نے بہت سے مخلص محب قوم، برگزیدہ شخصیتوں کو بے آبرو کیا ہے، اور خود غرض، بدخواہ افراد کی طالع آزمائی کو کامیابی سے ہم کنار کر کے قوم و ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

افواہوں کو جنم دینا انہیں پھیلانا اور ان کو تقویت پہنچانا نہایت ہی ناشائستہ و نامناسب عمل ہے، اللہ تعالیٰ نے اخبار و واقعات کے بارے میں یہ اصولی رہنمائی فرمائی ہے کہ جب کوئی ناقابلِ بھروسہ آدمی کوئی خبر لائے تو جب تک اس کی اچھی طرح تحقیق نہ ہو جائے اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ."

{الحجرات. ۶}

اے ایمان والو! اگر کوئی ناقابل بھروسہ (فاسق) شخص کوئی اہم خبر دے تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہ کہیں کسی قوم پر تم ناواقفیت میں حملہ کر دو کہ پھر تمہیں اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بے تحقیق خبروں پر یقین نہیں کرنا چاہئے، اور اگر اس پر یقین کیا گیا تو یہ نقصان اور مضرت کا باعث ہوگا، یہ آیت ایک خاص واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ بنو مصطلق کی طرف ____ جو مسلمان ہو چکے تھے ___ اپنے نمائندہ ولید بن عقبہ کو بھیجا، بنو مصطلق نے جب نمائندہ نبوی کو دیکھا تو ان کے احترام و توقیر کے لئے آبادی سے باہر نکل آئے، ولید نے سمجھا کہ یہ لوگ ان کے

قتل کے درپے ہیں اور پیچھے پاؤں واپس آگئے، آکر حضور کو اطلاع دی کہ یہ لوگ مرتد ہوگئے ہیں، یہ زکوٰۃ ادا کرنے سے منکر ہیں، اور وہ ان کے قتل کے درپے ہوگئے تھے، آپ ﷺ نے ان سے جہاد کا ارادہ فرمالیا، ابھی تیاری کے مرحلہ میں تھے کہ بنو مصطلق کا وفد آپہونچا، انھوں نے عرض کیا کہ آپ کے قاصد آرہے تھے، ہم اس لئے نکلے کہ ان کا استقبال کریں اور اپنی زکوٰۃ ان کی خدمت میں پیش کریں، ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے یہ خیال کیا ہے کہ ہم لوگ ان سے جنگ کے لئے نکلے تھے، سو یہ غلط ہے۔ اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی۔ (قرطبی: ۱۶/۳۱۱) ___ غور کیجئے کہ یہ عہد نبوی کا واقعہ ہے، اور یہ اطلاع ایک صحابی رسول کی تھی، انھوں نے دانستہ غلط بیانی سے یقیناً کام نہیں لیا تھا کہ یہ مقام صحابیت سے فروتر بات ہے، بلکہ یہ محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے، یہ نادانستہ غلط فہمی بھی کتنے بڑے انتشار کا پیش خیمہ بن سکتی تھی، تو جہاں افواہیں بالقصد پیدا کی جاتی ہوں، ان سے کس قدر نقصان ہوگا؟

افواہوں کے پھیلنے کے چند خاص اسباب ہیں، ان میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ لوگ ہر سنی سنائی ہوئی بات کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں خواہ وہ بات کس قدر بے سر و بنیاد ہو، بعض لوگوں نے اس کے لئے دروغ برگردن راوی کی ایک خود ساختہ مثل بھی تیار کر رکھی ہے، اور اس کے ساتھ ہر کہی اور ان کہی کو نقل کر دینے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے، یہ بھی خدا سے بے خوفی کی بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس بے احتیاطی کی تنقیص کرتے ہوئے فرمایا: آدمی کے گنہگار ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو نقل کر دے: کفی بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع (مسلم، حدیث نمبر (۷) مقدمۃ الکتاب) ہر سنی سنائی بات کو نقل کرنے سے معاشرہ میں کس طرح بگاڑ پیدا ہوتا اور فساد پھیلتا ہے، اس کی مثال رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں پیش آنے والا واقعۂ افک ہے، کچھ بیمار ذہن منافقین نے امت کی ماں سیدہ حضرت عائشہ صدیقہؓ پر تہمت لگادی، اور اس افواہ کو پھیلانے کی خوب کوشش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بعض سادہ لوح، مخلص مسلمان بھی اس میں شریک ہوگئے اور مدینہ میں ایسے انتشار کی کیفیت پیدا ہوئی کہ

حیاتِ نبوی میں شاید ہی کسی اور واقعہ سے آپ ﷺ کو اس درجہ تکلیف پہنچی ہو، یہ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ ایک سنی سنائی بات کو کچھ لوگ بلا تحقیق کہتے چلے گئے۔

ان افواہوں میں اضافہ ان لوگوں کی وجہ سے ہوتا ہے، جو بری باتوں کے متلاشی رہتے ہیں، لوگوں کی برائیوں اور کوتاہیوں کے درپے رہتے ہیں، تجسس سے جن کو لذت ملتی ہے، اور کسی واقعہ میں اگر چند احتمالات ہوں، تو منفی پہلو کی طرف ان کا ذہن زیادہ چلتا ہے، اس طرز عمل کو حضور نے پسند نہیں کیا، اسی لئے تجسس کو منع کیا گیا، اور ان لوگوں کو کج فکر قرار دیا گیا جو کسی بات کی غلط تاویل و توجیہ کے درپے ہوتے ہیں۔

"فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ" (آل عمران: ۷)

جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ فتنہ برپا کرنے اور (من مانی) تاویلیں کرنے کے لئے متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

افواہیں عام طور پر اعلانیہ نہیں پھیلائی جاتیں، ریڈیو اور اخبارات کو ان کا ذریعہ نہیں بنایا جاتا، (ویسے آج کل حکومتوں کے غیر ذمہ دارانہ اور ذرائع ابلاغ کے جانب دارانہ رویہ کی وجہ سے ایسا بھی ہو رہا ہے)، بلکہ زیادہ تر سینہ بسینہ افواہیں پھیلائی جاتی ہیں، اور سرگوشیوں کے ذریعہ گشت کرتی رہتی ہیں، اسی لئے زیادہ تر سرگوشیوں کو قرآن مجید نے پسند نہیں کیا: "لا خیر من کثیر فی نجواھم" (النساء: ۱۱۴)

کسی بھی خبر کے بارے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ یا تو انسان خود اس کی تحقیق کر لے، یا کم سے کم ایسے سمجھدار، معاملہ فہم، اور ذمہ دار آگاہ لوگوں کی طرف رجوع کرے، جن کے بارے میں توقع ہو کہ وہ مناسب طریقہ پر اس کی تحقیق کرنے کے بعد کوئی صحیح قدم اٹھائیں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

جب ان کو امن یا خوف کی کوئی بات پہونچتی ہے تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں، اگر وہ اس کو رسول اور اپنے میں سے ذمہ داروں تک پہونچا دیتے تو اسے وہ لوگ جان لیتے جو ان میں سے بات کی تہہ تک

پہنچ کر صحیح نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں، اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت
نہ ہوتی تو تم تو شیطان کی پیروی کرنے والے ہو جاتے۔ (النساء۔ ۸۳)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بنیادی مرض کا علاج بتایا ہے جو افواہوں کا باعث ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ جو باتیں اہم ہوں ان کے بارے میں اگر انسان خود تحقیق کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کی صلاحیت رکھنے والوں سے رجوع کرلے اور کسی بھی بات کو بلا تحقیق بیان کرنے، بلکہ خود بھی اس پر یقین کرنے سے گریز کرے۔ کیونکہ انسان اپنے کانوں، اپنی آنکھوں اور اپنے دلوں کا مالک نہیں بلکہ امین ہے، اس کے بارے میں وہ عنداللہ جوابدہ ہے: "ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا" (الاسراء: ۳۶)

(۲۲ مارچ ۲۰۰۲ء)

وعدہ خلافی — ہمارے سماج میں!

اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے لئے آخرت کا نظام یہ رکھا ہے کہ چیزوں کا مہیا ہونا انسان کی خواہشات کے تابع ہوگا۔ انسان جو چاہے گا فوراً اس کے لئے وہ چیز فراہم ہو جائے گی: "وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ" (حم السجدہ: ۳۱) لیکن دنیا کا معاملہ اس سے مختلف ہے، یہاں انسان ایک چیز کی خواہش کرتا ہے لیکن وہ اسے بروقت پورا نہیں کر سکتا، وہ ایک چیز کا ضرورت مند ہوتا ہے، لیکن وہ چیز اسے بروقت مہیا نہیں ہوتی، اسی لئے انسان ایک دوسرے سے لین دین کا محتاج ہوتا ہے، اس لین دین میں اکثر عہد و پیمان کی نوبت آتی ہے، اس لئے شاید ہی کوئی انسان ہو جس کو زندگی کے مختلف مراحل میں خود وعدہ کرنے یا دوسروں کے وعدہ پر بھروسہ کرنے کی نوبت نہ آتی ہو، وعدہ کرنے والے پر دوسرا شخص بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے، اور بعض دفعہ اسی اعتبار پر خود بہت سے معاملات طے کر گذرتا ہے، اس لئے وعدہ کی بڑی اہمیت ہے۔

اسی لئے اسلام میں بڑی تاکید کے ساتھ عہد کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور عہد شکنی کی مذمت کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عہد کو پورا کرو، کیونکہ قیامت کے دن عہد کے بارے میں انسان جواب دہ ہوگا: "وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا" (بنی اسرائیل: ۳۴) قرآن نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے، جو وعدہ کو پورا کیا کرتے ہیں، (البقرہ: ۱۷۷) ایک اور موقع پر بھی ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو اپنے وعدہ کا پاس و لحاظ رکھتے ہوں: "وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ" (المومنون: ۸) خود اللہ تعالیٰ نے اپنی اس صفت کا بار بار ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتے: "وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ" (الحج: ۴۷) اللہ کے نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعریف کرتے ہوئے خاص طور پر اس کا ذکر فرمایا گیا

کہ وہ وعدے کے سچے تھے "إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ" (مریم: ۵۴)

رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات کے ذریعہ بھی ایفاءِ عہد کی اہمیت اور وعدہ خلافی کی برائی کو بیان فرمایا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس میں تین باتیں پائی جائیں وہ منافق ہے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، اور امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ (بخاری، حدیث نمبر ۳۳) نفاق کفر کی ایک قسم ہے، اور وعدہ خلافی کو آپ ﷺ نے نفاق قرار دیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وعدہ خلافی کس قدر مذموم بات ہے، آپ ﷺ نے اپنے عمل کے ذریعہ ایفاءِ عہد کی ایسی مثال قائم کی ہے کہ اس کی نظیر ملنی دشوار ہے، عبداللہ بن ابی الحمساء سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ ﷺ سے خرید وفروخت کی، آپ کی کچھ چیز باقی رہ گئی، میں نے وعدہ کیا کہ میں یہ چیز یہیں لے کر آتا ہوں، میں بھول گیا، یہاں تک کہ آج اور آئندہ کل کا دن گذر گیا، تیسرے دن میں حاضر ہوا تو آپ اسی جگہ پر تھے، آپ ﷺ نے صرف اس قدر فرمایا: تم نے مجھے مشقت میں ڈال دیا، میں یہاں تین دنوں سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

(ابوداؤد، حدیث نمبر ۴۹۹۶)

وعدہ کی پابندی اور ایفاءِ عہد کا یہی سبق آپ ﷺ سے آپ کے رفقاء نے پڑھا، اور اپنی عملی زندگی میں اسے برت کر دکھایا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی وفات کا وقت آیا تو فرمایا کہ قریش کے ایک شخص نے میری بیٹی کے نکاح کا پیغام دیا تھا اور میں نے اس سے کچھ ایسی بات کہی تھی جو وعدہ سے ملتی جلتی ہے، تو میں ایک تہائی نفاق یعنی نفاق کی تین میں سے ایک علامت کے ساتھ اللہ سے ملنا نہیں چاہتا، اس لئے میں تم لوگوں کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اس سے اپنی بیٹی کا نکاح کیا۔ (احیاء العلوم: ۳/۱۳۲) ـــ ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کی نگاہ میں وعدہ کو پورا کرنے کی کس قدر اہمیت تھی، دوست ہو یا دشمن، اپنا ہو یا بیگانہ، مسلمان ہو یا غیر مسلم، ہر ایک کے ساتھ عہد کی پابندی ضروری ہے، رسول اللہ ﷺ صلح حدیبیہ سے جوں ہی فارغ ہوئے حضرت ابوجندلؓ خون میں لت پت اور پاؤں میں بیڑیاں لگی ہوئی تشریف لائے،

اور مسلمانوں سے عرض کناں ہوئے کہ انہیں مدینہ لے جایا جائے، آپ ﷺ نے بڑی محبت کو راضی کرنے کی کوشش کی: کہ اس دفعہ سے جو مکہ سے مسلمان ہو کر مدینہ جانے والوں کو واپس کرنے کے سلسلہ میں ہے، حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کو مستثنیٰ رکھا جائے، لیکن اہل مکہ نہیں مانا، چنانچہ بالآخر آپ نے انہیں واپس فرما دیا، اسی طرح جن غیر مسلم قبائل سے آپ کے معاہدات ہوئے، آپ نے ان معاہدات کا پورا خیال رکھا، بلکہ بعض دفعہ مخالفین کی عہد شکنی کو برداشت کرتے ہوئے بھی آپ اپنے عہد پر قائم رہے۔

افسوس کہ اخلاقی انحطاط اور پستی کی وجہ سے آج سماج میں وعدہ خلافی کی نوع بنوع صورتیں مروج ہو گئی ہیں، اور لوگوں کے ذہن میں اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے، عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ قرض وغیرہ کے لین دین ہی سے وعدہ کا تعلق ہے، حالانکہ ہم زندگی کے تمام مراحل میں عہد و پیماں سے گذرتے ہیں، معاملات جتنے بھی ہیں، نکاح، خرید و فروخت، شرکت اور پارٹنرشپ، دو طرفہ وعدوں سے عبارت ہے، اسی لئے معاملات کو عقد کہا جاتا ہے، عقد کے معنی دو طرفہ وعدہ اور معاہدہ کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ایک سے زیادہ مواقع پر ایفاء عقود کی طرف متوجہ فرمایا ہے: "وَاَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" (المائدہ: ۱) نکاح کے ذریعہ مرد عورت کے ساتھ حسن سلوک اور اس کے اخراجات کی ادائیگی کا عہد کرتا ہے، اور عورت جائز باتوں میں شوہر کی فرماں برداری کا وعدہ کرتی ہے، لہٰذا اگر شوہر بیوی کے ساتھ حق تلفی کرے یا بیوی شوہر کے ساتھ حکم عدولی تو نہ صرف حق تلفی اور حکم عدولی کا گناہ ہوگا بلکہ وہ وعدہ خلافی کے بھی گناہ گار ہوں گے، بیچنے والا گاہک سے مال کے صحیح ہونے اور قیمت کے مناسب ہونے کا وعدہ کرتا ہے، اگر وہ گاہک سے عیب چھپا کر سامان بیچے یا قیمت میں معمول سے زیادہ نفع وصول کرے، اور گاہک کو جتائے کہ اس نے معمولی نفع پر سامان فروخت کیا ہے، تو یہ عقد تجارت کے ذریعہ فریقین ایک دوسرے کے ساتھ جو عہد کرتے ہیں، اس کی خلاف ورزی ہے۔

جب آپ کسی ملازمت کرتے ہیں تو سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ میں جو اوقات کار متعین ہوں، آپ ان اوقات میں اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہنے کا عہد کرتے ہیں، اگر آپ

ان اوقات کی پابندی نہ کریں، دیر سے دفتر پہنچیں، پہلے دفتر سے نکل جائیں، یا درمیان میں دفتر چھوڑ دیں، یا دفتر کے اوقات میں مفوضہ کاموں کو انجام دینے کے بجائے اپنے ذاتی کام کرنے لگیں، تو یہ بھی وعدہ کی خلاف ورزی میں شامل ہے، بعض شعبوں میں ملازمین کو خصوصی الاؤنس دیا جاتا ہے، کہ وہ پرائیوٹ طور پر کوئی اور کام نہ کریں، مثلاً میڈیکل شعبہ میں گورنمنٹ چاہتی ہے کہ ڈاکٹر کی پوری صلاحیت سرکاری دواخانے میں آنے والے مریضوں پر خرچ ہو، کیوں کہ انسان کی قوت کار محدود ہے، اور جو شخص ہسپتال میں آنے سے پہلے اپنی قوت ڈھیر سارے مریضوں کو دیکھنے پر صرف کر چکا ہو، یقیناً اب جو مریض اس کے سامنے آئیں گے، وہ کما حقہ ان کی تشخیص نہیں کر سکے گا، اب اگر کوئی شخص گورنمنٹ سے الاؤنس بھی حاصل کرے، اور نجی کلینک اور نرسنگ ہوم بھی چلائے تو یہ وعدہ خلافی ہی کے زمرے میں آئے گا، اور یہ بات تو ستم بالائے ستم ہوگی کہ جب کوئی مریض سرکاری دواخانہ میں آئے، تو معالج اس سے ایسی بے اعتنائی برتے، کہ وہ اس کے پرائیوٹ دواخانہ سے رجوع ہونے پر مجبور ہو جائے، یہ وعدہ خلافی کے ساتھ ساتھ عوام پر کھلا ہوا ظلم بھی ہے۔

آج کل بعض سواریوں کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے میٹر لگے ہوئے ہیں، اس میٹر میں فریقین کی رعایت ملحوظ ہے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ مسافرین کی مجبوری اور ضرورت کو دیکھتے ہوئے میٹر سے زیادہ پیسے طلب کئے جاتے ہیں، یہ بھی وعدہ خلافی کے زمرہ میں داخل ہے، کیوں کہ گورنمنٹ کا یہ لائسنس انہی کے قواعد وضوابط کے ساتھ مربوط ہے، گویا لائسنس لینے والا اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ گورنمنٹ کی ہدایت کے مطابق ہی پیسے وصول کرے گا، لوگوں کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے زائد پیسوں کا طلب کرنا اس عہد کی خلاف ورزی ہے۔

وعدہ کا تعلق ہماری تقریبات، جلسوں اور دعوتوں سے بھی ہے، مثلاً دعوت نامہ میں لکھا گیا کہ نکاح عصر کے بعد ہوگا، لیکن جب تقریب میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ نوشہ صاحب اپنی شان خاص کے ساتھ مغرب کے بعد تشریف لائے، دعوت نامہ میں لکھا گیا کہ

طعام ولیمہ ۸ بجے شب تک ہے، لیکن حقیقت میں دعوت کی ابتداء دس بجے شب سے ہوئی۔ کیا یہ عہد کی خلاف ورزی نہیں ہے؟ غور کیجئے کہ لوگ ایسی تقریبات میں شرکت اپنے تعلقات کی پاسداری میں کرتے ہیں، کسی کے یہاں بیماری ہے، کوئی خود بیمار ہے، کسی نے تقریب کے وقت کے لحاظ سے آئندہ پروگرام بنا رکھا ہے، ایسے مواقع پر بے جا تاخیر ان کے لئے کس قدر گراں گذرتی ہے، شرکت نہ ہونے میں میزبان کی ناگواری کا اندیشہ، اور انتظار کرنے میں دوسرے پروگرام متاثر!

افسوس کہ دینی جلسوں اور پروگراموں میں بھی ہم اس کی رعایت ملحوظ نہیں رکھتے۔ اعلان ہوا کہ نمازِ عشاء کے فوراً بعد جلسہ شروع ہوگا، لیکن عملاً مزید دو گھنٹہ تاخیر سے جلسہ کا آغاز ہوا، دعوت نامے میں صبح ۹ بجے سے جلسہ کا اعلان کیا گیا، لیکن جلسہ کا آغاز ہی ۱۱ بجے کے بعد ہوا، یہ وعدہ خلافی بھی ہے، اور وقت کی ناقدری بھی، کچھ یہی حال بعض مقررین کا ہوتا ہے، مقرر صاحب کو وقت ۲۰ منٹ کا دیا گیا، لیکن جب مائک ان کے ہاتھ میں آیا تو انہیں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اس پروگرام میں ان کے سوا کسی اور کو تقریر کا حق نہیں، اور اس طرح دوسرے مقررین کے لئے یا تو وقت نہیں بچا، یا سامعین کے صبر کا امتحان ہوتا رہا، حالانکہ اسلام نے تمام عبادتوں کو وقت کے ساتھ مربوط رکھا ہے، نماز کے لئے اوقات مقرر ہیں، وقت گذر جائے تو نماز قضاء ہو جائے گی، وقت سے پہلے پڑھ لی جائے تو نماز ادا ہی نہ ہوگی، روزہ بھی وقت سے متعلق ہے، وقت سے پہلے افطار کرے تو روزہ درست نہیں ہوگا، وقت کے بعد سحری کھائے، تب بھی روزہ فاسد ہو جائے گا، حج بھی پانچ مقررہ ایام میں کیا جاتا ہے، اور حج کے تمام افعال کے لئے اہم اوقات مقرر ہیں، زکوٰۃ کا تعلق بھی سال پر سال گذرنے سے ہے، عجیب بات ہے کہ جس دین میں وقت کا اتنا پاس و لحاظ ہو، اسی دین کے ماننے والوں میں وقت کی اس درجہ ناقدری اور ناحق شناسی! یہ سب باتیں وعدہ خلافی میں داخل ہیں!

ہم جب کسی ملک کی شہریت اختیار کریں تو گویا اس ملک کے قوانین پر عمل کرنے کا عہد کرتے ہیں، لہٰذا جب تک وہ قوانین اسلامی تعلیمات کے خلاف نہ ہوں یا صریحاً ظلم پر مبنی

نہ ہوا ان قوانین کا پابند رہنا ہم پر واجب ہے، اور اس کی رعایت نہ کرنا ملک کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی خلاف ورزی ہے، اس لئے اس سے بچنا ضروری ہے — غرض سماجی زندگی میں ہم ہر جگہ ایک عہد کے پابند ہیں، بعض عہد ہم اپنی زبان سے کرتے ہیں، بعض عہد ملک کے شہری ہونے کے لحاظ سے از خود ہم سے متعلق ہو جاتا ہے، بعض عہد کسی معاملہ کی وجہ سے شرعاً ہمارے ذمہ ہوتا ہے، اور بعض سماج کے عرف و رواج کی بنیاد پر بھی ہمارے لئے واجب العمل ہوتا ہے، ہم پر ان سب کی پاسداری ضروری ہے، مگر زندگی کے کتنے ہی مراحل میں ہم اپنے عہد و پیمان توڑتے ہیں، اور وعدے وفا نہیں کرتے، اس پر وقت نظر کے ساتھ غور کرنے اور وعدہ خلافی و بدعہدی کے گناہ سے بچنے کی ضرورت ہے۔

(۲۴؍اگست ۲۰۰۱ء)

ایک مہلک بیماری جو خریدی جاتی ہے

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو کچھ پیدا کیا ہے وہ اصل میں انسان ہی کے نفع کے لئے ہے، بشرطیکہ انسان اس کا صحیح استعمال کرے۔ دنیا میں یقیناً ایسی چیزیں بھی ہیں کہ غلط طریقہ پر ان کا استعمال طرح طرح کی بیماریوں کا سبب اور ہلاکت کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا کی ہے اور تجربات سے فائدہ اٹھانے کا شعور بخشا ہے۔ اس سے بڑھ کر ناسمجھی کی کوئی اور بات نہیں ہو سکتی کہ انسان ایک شئی کے نقصان کو جانتے اور سمجھتے ہوئے پھر اسی کو استعمال کرتا چلا جائے، اور اپنی گاڑھی کمائی ایک ایسی چیز پر خرچ کرے جو خود اس کو نقصان پہنچانے والی ہو۔

لیکن عجیب بات ہے کہ ٹھیک صورت حال یہی ہے کہ محنت اور مشقت سے حاصل کی ہوئی دولت کا پیمانہ، خصوصاً ہماری سوسائٹی میں بہت سے لوگ اسی طرح ضائع کرتے ہیں اور قیمتاً مہلک بیماریاں خرید کرتے ہیں، تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ صرف جاہل، ناخواندہ عوام ہی اس میں مبتلا نہیں ہیں، بلکہ پڑھے لکھے صاحب ذوق و ادب اور ارباب فکر و دانش بھی اس نادانشمندانہ عمل میں برابر کے شریک ہیں۔ آپ کے لئے یقیناً یہ بات باعث حیرت ہوگی کہ آخر وہ کیا بیماری ہے جو مہلک اور تکلیف دہ بھی ہے۔ لیکن پیسہ دے کر خریدی جاتی ہے اور پڑھے لکھے سمجھدار لوگ بھی اسے خریدتے ہیں، لیکن آپ حیرت زدہ نہ ہوں، یہ ایک واقعہ ہے اور آپ کو اپنے گرد و پیش، دوست احباب میں ہی اس کی کئی ہی مثالیں مل جائیں گی!

یہ بیماری ہے "تمباکو کا استعمال" خواہ آپ پان کے ساتھ زردہ کے نام سے استعمال کریں، یا بیڑی اور سگریٹ کی صورت میں، آپ اپنے منہ کو چمنی بنائیں یا آپ

نسوار کی شکل میں ناک میں اس کا استعمال کریں یا دانت میں مَل کر تسکین خاطر کا سامان کریں، یہ تمام صورتیں دراصل بیماریاں ہیں، دراصل بیماریوں کا پیش خیمہ ہیں جو انسان کو شدید قسم کے آلام میں مبتلا کرتی ہیں اور بالآخر زندگی کی نعمت سے محروم کر دیتی ہیں۔

یہ بلا مشرقی ممالک میں غالباً مغربی ممالک ہی سے درآمد ہوئی ہے، علامہ طحطاوی نے شیخ نجم غزی شافعی سے نقل کیا ہے کہ دمشق میں پہلی دفعہ ۱۰۱۵ھ میں اس کا ظہور ہوا، (طحطاوی علی المراقی ص ۲۰۳) اسی کے آگے پیچھے ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں تمباکو کی آمد ہوئی، ہندوستان میں گو تمباکو بہت پہلے سے موجود رہا ہے، لیکن مسلم عہد حکومت میں اکبر کے دور میں حقوں کی صورت تمباکو نوشی کے رواج میں اضافہ ہوا، بعض محققین کا خیال ہے کہ تمباکو کا ورود اولاً جنوبی ہندستان کے علاقہ میں ہوا ہے چنانچہ حکیم محمد عبداللہ رقمطراز ہیں:

> تمباکو ابتداء میں جنوبی ہند کی طرف سے آیا جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اہل فرنگ ہند میں اسی جانب سے وارد ہوئے تھے، امریکہ کا جنگلی تمباکو آج کل بھی بمبئی، جزائر گوا اور لنکا میں بکثرت پیدا ہوتا ہے، آثار رشتی میں مرقوم ہے کہ تمباکو پہلے دکن میں آیا اور وہاں سے اکبر کے زمانہ میں شمال مشرقی ہند میں پہنچا۔ (خواص تمباکو: ۱۰، ۱۲)

تمباکو اور سگریٹ کے نقصانات اب کوئی ایسی چیز نہیں رہی جو محتاج بیان ہو، اب اس کے نقصانات مسلّمات میں سے ہیں، یوں تو یہ انسان کے پورے وجود کے لئے مضرت رساں ہیں، لیکن خاص کر پھیپھڑے کے لئے سمِ قاتل ہے، برطانیہ میں ۱۹۵۷ء میں ایک طبی بورڈ مقرر کیا گیا تھا، جس نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اکثر اموات کا سبب پھیپھڑے کا کینسر ہے۔ اور یہ تمباکو کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے ۱۹۶۲ء رپورٹ کے بموجب برطانیہ میں ایک سال میں ۲۳ ہزار انسان کی موت صرف پھیپھڑے کے کینسر سے ہوئی جس کا سبب سگریٹ کا استعمال تھا، اس کے علاوہ منہ اور حلق کا کینسر اور دل کی بیماریاں تمباکو کے استعمال کی رہین منت ہیں، تازہ امریکی تحقیق کے مطابق تمباکو میں

شامل جزو "پائرین" تمباکو نوشی کے "جین" کو کمزور کر کے کینسر کے جراثیم سے لڑنے کی جسمانی صلاحیت کو کمزور کر دیتا ہے۔ انسانی جسم میں اگر "جین، پی 53" صحت مند ہو تو وہ کینسر کے مقابلہ قوت مدافعت فراہم کرتا ہے اور یہی جین تمباکو نوشی سے اپنی قوت کھو بیٹھتا ہے۔ حالیہ تحقیق کے مطابق امریکہ میں کینسر سے جو افراد موت کا شکار ہوتے ہیں، ان میں سے دو تہائی افراد کی تمباکو نوشی، موٹاپا جیسے زہر خوری اور کاہلی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

(روزنامہ منصف ۲۰ جولائی، سائنس ٹکنالوجی ایڈیشن)

سگریٹ میں جو نکوٹین پائی جاتی ہے، خون پر اس کے مختلف مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں تمباکو کا اثر انسان کی قوت ہضم پر بھی پڑتا ہے، آج کل تمباکو خوری کی جو نئی صورتیں وجود میں آئی ہیں جس میں سب سے کثیر الاستعمال "گٹکا" ہے، یہ تو اور بھی زیادہ مضرت رساں ہے، اس سے مسوڑھوں اور منھ کے باہری حصہ کا کینسر ہوتا ہے اور گٹکا خوری کی وجہ سے کینسر پیدا ہونے کا تناسب تشویش ناک حد تک بہت زیادہ ہے، اسی لئے ہمارے ملک اور دنیا کے متعدد ملکوں میں سگریٹ کے پیکٹ پر قانوناً اس جملہ کے لکھنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے کہ "سگریٹ پینا صحت کے لئے نقصان دہ ہے" اور اب ہمارے ملک میں تمباکو خوری اور تمباکو نوشی کو روکنے کے لئے بعض اور تدابیر کی طرف بھی توجہ کی جارہی ہے۔

مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو تمباکو نوشی کو عام طور پر ناپسند کیا گیا ہے، ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں بھی تمباکو نوشی کی ممانعت وارد ہوئی ہے، "برہما پران" ہندو پرانوں میں سے ایک ہے، اس میں یہاں تک مذکور ہے کہ تمباکو نوشی کرنے والا برہمن کو "دان" (عطیہ) دیتا ہو پھر بھی وہ نرک (جہنم) ہی میں جائے گا۔ "اسکند پران" میں ہے کہ "برہمن، چھتری اور ویش جو تمباکو پیتے ہیں وہ چنڈال کی طرح ہیں"۔ بائیبل کے سرقی میں آٹھ قسم کی منشیات کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ایک تمباکو بھی ہے، سکھوں کے دسویں گرو گوبند سنگھ جی نے اپنے پیروؤں پر تمباکو کے استعمال کو ممنوع قرار دیا تھا، (ہدایت، شمارہ: ۲۰۰۸ء، ص ۳۲) اسی لئے گرودواروں میں تمباکو رکھنے کو بھی سخت

خلاف احتیاط سمجھا جاتا ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو عرب میں رسول اللہ ﷺ کے عہد میں تمباکو غالباً نہیں پایا جاتا تھا، گو بعض روایات میں تمباکو کی مذمت وارد ہوئی ہے، لیکن یہ روایات صد درجہ ضعیف اور نامعتبر ہیں، مگر اسلام کی اصولی تعلیمات سے تمباکو کا حکم جانا جا سکتا ہے۔
اسلام نے بنیادی طور پر تمام نباتات کو حلال رکھا ہے، سوائے ان نباتات کے جو نشہ آور ہوں، مہلک ہوں یا صحت و توانائی کے لئے ضرر رساں ہوں اور ظاہر ہے کہ تمباکو کا جسم انسانی کے لئے مضر ہونا ایک مسلّمہ اور متفقہ حقیقت ہے، نیز رسول اللہ ﷺ نے ہر "مسکر" اور "مفتر" شئی سے منع فرمایا ہے۔ نهى عن كل مسكر ومفتر (ابوداؤد، باب ماجاء في السكر) مسکر سے مراد نشہ آور اشیاء ہے اور مفتر کا لفظ "فتور" سے ماخوذ ہے، فتور کے معنی کمزوری اور گراوٹ کے ہیں، علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں: ضعف وانكسار (نہایہ ۳؍۴۰۸) پس "مفتر" کا لفظ ہر ایسی چیز کو شامل ہے جو انسانی جسم اور صحت کو کمزوری سے دوچار کرتا ہو، اسی لئے علامہ محمد عبد الرؤف مناوی نے "حشیش" کو بھی مفتر اشیاء میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ علامہ زین الدین عراقی نے بھی اسی حدیث سے "حشیش" کے حرام ہونے پر استدلال کیا ہے۔ (دیکھئے: فیض القدیر ۶؍۳۳۸) اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ مفتر اشیاء میں تمباکو بھی شامل ہے۔

تمباکو کے احکام کی بابت فقہاء اسلام کے درمیان اختلاف رائے ہے، بعض حضرات نے اس کی مضرتوں کی وجہ سے اسے بالکل ہی حرام قرار دیا ہے، بعض حضرات نے بالکل ہی جائز اور مباح، کیونکہ چیزوں میں اصل مباح ہونا ہے اور بعض اہل علم کے نزدیک یہ مکروہ ہے، فقہاء شوافع میں علامہ نجم غزی اس کو حرام قرار دیتے ہیں، (طحاوی: ۲۰۳) اور طحاوی ہی نے بعض فقہاء حنفیہ سے اس کی کراہت نقل کی ہے، ہندوستان میں ماضی قریب کے اہل علم زیادہ تر اس کے جواز کے قائل ہیں، البتہ اس کو خلاف اولیٰ سمجھتے ہیں اور مسجد جاتے وقت منہ صاف کر کے جانے کی تلقین کرتے ہیں، مولانا رشید احمد گنگوہی، (فتاویٰ رشیدیہ: ۴۸۱) مولانا اشرف علی تھانوی (امداد الفتاویٰ ۴؍۱۱۳) اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی

(فتاویٰ رضویہ ۱۱/۳۵۵) اور ان سے پہلے کے اہل علم میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی (مجموعۃ الفتاویٰ ۱/۳۴۹) کے فتاویٰ ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں، لیکن عرب علماء کا عام رجحان اس کے ناجائز ہونے کی طرف ہے، شیخ عبدالعزیز بن باز، شیخ محمد ابراہیم آل شیخ کے فتاویٰ اس سلسلہ میں بار بار سعودی عرب سے طبع ہو چکے ہیں، شیخ محمد ابراہیم کا فتویٰ بہت تفصیلی ہے، اور انہوں نے حنفیہ، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ چاروں دبستان فقہ کے اہل افتاء کے فتاویٰ اس کی حرمت و ممانعت پر نقل کئے ہیں، یہی رائے علماء ہند میں مولانا عبدالرحمان مبارکپوری کی ہے، (تحفۃ الاحوذی ۳/۳۳۴) فقہی نقطۂ نظر سے یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ تمباکو کا استعمال مکروہ ہے اور طبی اعتبار سے تمباکو کے استعمال کی جو صورت جتنی زیادہ مضرت رساں ہو اس میں اسی قدر شدت کے ساتھ کراہت پائی جائے گی، ایسا لگتا ہے کہ ہمارے علماء ہند تک اس کے نقصانات اور مضرتوں کی تفصیلات نہیں پہنچ پائی تھیں، انہوں نے تمباکو کے صرف ظاہری اور وقتی اثرات پر نگاہ رکھی اور اس کے اندرونی اور مستقل مضرتوں اور ہلاکت خیزیوں کے بارے میں ان کو کما حقہ علم نہیں ہو پایا، آج کل جو طبی تحقیقات سامنے آرہی ہیں، اگر یہ ان کے سامنے موجود ہوتیں تو یقیناً ان کا رجحان اس بارے میں زیادہ شدید ہوتا۔

تمباکو نوشی کے نقصانات عالم اسلام میں جب کبھی بھی سامنے آئیں اس کو روکنے کی بھرپور تدابیر کی گئیں، ۱۰۳۳ھ میں سلطان احمد اول نے تمباکو کی تمام دکانیں بند کرنے کا حکم دیا، سلطان مراد چہارم کے بارے میں تو منقول ہے کہ وہ تمباکو نوشی کرنے والوں کے دونوں ہونٹ اور نسوار استعمال کرنے والے کی ناک کٹوا دیتا تھا، شریف مکہ مسعود بن مسعود نے ۱۱۳۶ھ میں برسر عام قہوہ خانوں اور بازاروں میں تمباکو نوشی کی ممانعت کا فرمان جاری کر دیا تھا، سوڈان میں مہدی تحریک تمباکو استعمال کرنے والوں کو اسی ۸۰ کوڑے اور ایک ہفتہ قید کی سزا دیتا، مغل بادشاہ جہانگیر نے اپنی قلمرو میں تمباکو نوشی پر سخت پابندی عائد کر دی تھی، کم و بیش دوسری قوموں میں بھی ملک و قوم کے بہی خواہ حکمرانوں نے تمباکو نوشی کا سد باب کرنے کی بھی کوشش کی، انگلینڈ میں شاہ جیمس اول نے سر والٹر ریلی کو

جس نے انگلینڈ میں تمباکو کو فروغ دیا، گرفتار کر کے سزائے موت دی، سترہویں صدی کے اواخر تک روسی حکام تمباکو نوشوں کو سخت سزا دیا کرتے، پہلی دفعہ کوڑے لگاتے، دوسری بار پینے پر ناک کاٹ دیتے اور تیسری دفعہ میں سزائے موت دے دیتے۔

(ماہنامہ ہدایت، شمارہ ۷، صفحہ ۳۰)

تمباکو نوشی فطرتِ سلیمہ کے لئے مستقل طور پر نہایت مذموم، ناپسندیدہ، ناقابلِ ترک اور لائقِ اجتناب شئی ہے، اس سے بچنا اور اگلی نسلوں کو اس سے بچانا ہم سب کا فریضہ ہے، بدقسمتی سے نوجوانوں کے لئے اب یہ ایک فیشن بنتا جا رہا ہے، اگر ہم نے اپنی نسلوں کو اس بلا و بے درماں سے بچانے کی کوشش نہیں کی تو یہ ان کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہوگا۔

(۳۰ رجولائی ۱۹)

خودکشی —— تشویشناک سماجی مسئلہ

زندگی بہت بڑی نعمت ہے، ایسی نعمت جس کا کوئی بدل نہیں، جو جانے کے بعد واپس نہیں آتی، انسان یہ نعمت اپنی محنت اور تگ و دو سے حاصل نہیں کرتا بلکہ کو قدرت کے رب کا عطیہ ہے، ایسا عطیہ جو علم و تحقیق کی اتنی ترقی کے باوجود ایک سربستہ راز ہے، علم و سائنس کی ترقی اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ انسان اپنے ایک ایک عضو کے بارے میں جاننے لگا ہے کہ وہ اس کا مجموعہ ہے؟ سر کے بال سے پاؤں کے ناخن تک اس نے بدن کے ایک ایک انگ اور رگ و ریشہ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے، لیکن آج بھی عقل اس گرہ کو کھولنے سے عاجز ہے اور قدرت کے راز سربستہ سے پردہ اٹھانے میں ناکام ہے کہ آخر روح کی حقیقت کیا ہے؟ یہ جسم میں کیوں کر آتی ہے اور کہاں سے آتی ہے؟ پھر کس طرح چپ چاپ جسم کو داغِ فراق دے کر چلی جاتی ہے کہ نہ کوئی ہاتھ ہے جو اسے تھام سکے، نہ کوئی حساس سے حساس مشینی آلات ہیں، جو اس کو گرفتار کر سکیں، نہ کم سے کم اس کی حقیقت کا ادراک ہی کر سکیں، انسان کی یہ مجبوری اور بے بسی ہی خدا کا یقین دلاتی ہے اور ایمان میں تازگی پیدا کرتی ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ آپ ﷺ سے روح (زندگی) کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ ﷺ فرما دیں کہ یہ میرے رب کے حکم اور فرمان سے عبارت ہے: "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ"۔ (بنی اسرائیل: ۸۵)

پس انسان اپنی "زندگی" کا خود مالک نہیں ہے بلکہ امین ہے، زندگی اس نے حاصل نہیں کی ہے، بلکہ اسے عطا فرمائی گئی ہے، یہ اس کے پاس خالق کائنات کی امانت ہے اور ممکن حد تک اس کی حفاظت اس کی ذمہ داری ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے بیماری کا علاج کرنے کی تاکید فرمائی، خود آپ ﷺ نے اپنا علاج کرایا اور اسی لئے علماء نے

لکھا ہے کہ علاج کرانا توکل کے خلاف نہیں، کیوں کہ توکل اور قناعت کے اعلیٰ درجہ پر حضرات انبیاء کرام فائز تھے اور وہ علاج بھی کراتے تھے اور حفظانِ صحت کے اصولوں کی رعایت بھی کرتے تھے۔

کوئی بھی ایسا عمل جو انسانی صحت یا زندگی کے لئے مضرت رساں ہو اور انسانی زندگی کو خطرہ میں ڈال سکتا ہو، جائز نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے ہر ایسی چیز کے کھانے سے منع فرمایا، جو نشہ آور یا جسم کو نقصان پہنچانے والی (مفتر) ہو۔ "مفتر" یعنی جسم کے لئے مضرت رساں چیزوں کے کھانے کی ممانعت تو ظاہر ہے کہ صحت اور زندگی کے تحفظ کے لئے ہے، لیکن نشہ آور چیزوں سے منع کرنے کی وجہ جہاں یہ ہے کہ اس سے انسان کی عقل وفہم پر زد پڑتی ہے اور بہت سے اخلاقی مفاسد اس کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، وہیں یہ بھی سبب ہے کہ یہ ایک میٹھا زہر ہے جو موت کی طرف زندگی کے سفر کی رفتار کو بڑھا دیتا ہے۔

اسی لئے فقہاء نے نباتات میں ایسی چیزوں کے کھانے کو ناجائز قرار دیا ہے، جو زہر کے قبیل سے ہوں اور انسانی زندگی کے لئے خطرہ کا باعث ہو سکتی ہوں۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۳-۲۶۰۵)

اسلام تو اللہ کی عبادت اور بندگی میں بھی ایسے غلو کو پسند نہیں کرتا کہ انسان اپنی صحت کو برباد کر لے اور جان جوکھم میں ڈال دے، عہد نبوی ﷺ میں بعض حضرات نے یہ معمول بنایا تھا کہ رات بھر عبادت میں مشغول رہتے اور دن میں روزہ رہتے، ایک دوسرے صحابی حضرت سلمان فارسیؓ نے ان کو اس سے منع کیا اور فرمایا تم پر تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہارے اپنے وجود کا بھی حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، اس لئے کبھی روزہ رکھو اور کبھی نہ رکھو، نماز بھی پڑھو اور سونے کا بھی اہتمام کرو، حضور ﷺ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے حضرت سلمانؓ کے نقطۂ نظر کو درست قرار دیا اور تصویب فرمائی۔ (بخاری، ۱/۲۶۴) آپ ﷺ نے جان بچانے کے لئے دوا کے طور پر ایسی چیزوں کے استعمال کی بھی اجازت دی جو عام حالات میں ناجائز اور حرام ہیں۔ (بخاری ۲/۸۴۶)

یہ اور اس طرح کی اسلامی تعلیمات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جیسے اسلام نے دوسروں کی جان بچانے کا حکم دیا ہے، اسی طرح انسان پر یہ بات بھی واجب ہے کہ وہ

بحدِ امکان اپنی جان کی حفاظت کرے، کیوں کہ زندگی اس کے پاس خدا کی امانت ہے اور امانت کی حفاظت اسلامی، اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے، اسی لئے اسلام کی نگاہ میں "خود کشی" بہت بڑا گناہ اور سنگین جرم ہے، ایسا گناہ جو اس کو دنیا سے بھی محروم کرتا ہے اور آخرت سے بھی، خود قرآن مجید نے خود کشی سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: "لا تقتلوا انفسکم" (النساء: ۲۹) اور پیغمبر اسلام ﷺ کے متعدد ارشادات ہیں جن میں نہایت سختی اور تاکید کے ساتھ خود کشی کو منع فرمایا گیا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا کر خود کشی کی وہ جہنم کی آگ میں بھی اسی طرح ہمیشہ گرتا رہے گا اور جس شخص نے لوہے کی ہتھیار سے خود کو ہلاک کیا وہ دوزخ میں بھی ہمیشہ اپنے پیٹ میں ہتھیار گھونپتا رہے گا۔ (بخاری) ایک اور روایت میں ہے کہ گلا گھونٹ کر خود کشی کرنے والا جہنم میں ہمیشہ گلا گھونٹتا رہے گا اور اپنے آپ کو نیزہ مار کر ہلاک کرنے والا دوزخ میں بھی ہمیشہ اپنے آپ کو نیزہ مارتا رہے گا۔ (بخاری)

حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ کے ساتھ ایک اور صاحب نے مدینہ ہجرت کی، دوسرے صاحب بیمار پڑ گئے، تکلیف کی شدت کے باعث ان سے صبر نہ ہو سکا اور ایک ہتھیار سے اپنی انگلیوں کے جوڑ کاٹ دیئے، رگیں کٹ گئیں اور خون اتنا بہہ گیا کہ انتقال ہو گیا، حضرت طفیلؓ نے ان کو خواب میں دیکھا کہ وہ بہتر حالت میں ہیں، لیکن ان کے ہاتھ ڈھکے ہوئے ہیں، حضرت طفیلؓ نے دریافت کیا کہ آپؓ کے رب نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ ان صاحب نے کہا: اللہ نے ہجرت کی وجہ سے مجھے معاف کر دیا، لیکن میرے ہاتھوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ جس چیز کو تم نے خود بگاڑ لیا ہے، میں اسے درست نہیں کر سکتا، حضرت طفیل نے یہ خواب حضور ﷺ سے بیان کیا، آپ ﷺ نے دعا فرمائی کہ بار الٰہ! ان کے ہاتھوں کو بھی معاف فرما دے! (مسلم عن جابرؓ)

صحابی رسول حضرت جندبؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے کی قوموں میں ایک شخص کو زخم تھا، وہ تکلیف برداشت نہ کر سکا، چھری لی اور اس سے اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا، خون تھم نہ سکا اور موت واقع ہو گئی، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میرے بندہ نے اپنی

ذات کے معاملہ میں مجھ پر سبقت کرنے کی کوشش کی، اس لئے میں نے اس پر جنت حرام کر دی۔ (بخاری و مسلم) رسول اللہ ﷺ رحمت مجسم تھے، لیکن اس کے باوجود حضرت جابر بن سمرہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے خودکشی کر لی تو آپ ﷺ نے اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ (ترمذی) اسی لئے ایک جلیل القدر فقیہ اور محدث امام احمدؒ کا خیال ہے کہ خودکشی کرنے والے شخص پر عام لوگ تو نماز جنازہ پڑھیں گے، لیکن امام المسلمین نماز جنازہ نہیں پڑھے گا۔ (ترمذی)

رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خودکشی اسلام کی نگاہ میں کتنا سنگین جرم ہے؟ یہ دراصل زندگی کے مسائل اور مشکلات سے راہ فرار اختیار کرنا ہے اور آزمائشوں اور اپنی ذمہ داریوں سے بھاگ نکلنے کی ایک غیر قانونی اور ایک غیر انسانی تدبیر ہے، بدقسمتی سے ایمان سے محرومی یا کمزوری اور اپنی ذمہ داریوں سے بے اعتنائی کے باعث اس وقت پوری دنیا میں خودکشی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے، مغربی ممالک میں سماجی نظام کے بکھراؤ کی وجہ سے عرصہ سے خودکشی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے، مغربی ممالک میں سماجی نظام کے بکھراؤ کی وجہ سے عرصہ سے خودکشی کو انسان کا بھی حق تسلیم کیا جاتا ہے، جو لوگ طویل عرصہ سے بیمار ہوں، ان کو بعض مغربی ملکوں میں مہلک انجکشن لگوا کر مر جانے کی قانونی اجازت حاصل ہو گئی ہے، بلکہ ان کے ورثاء اور رشتہ داروں کو بھی اس کی اجازت دے دی گئی ہے اور اس کو "قتل بجذبۂ رحم" کا خوبصورت نام دیا گیا ہے۔

چند سالوں سے ہمارے ملک ہندوستان میں بھی خودکشی کے واقعات میں بڑا اضافہ ہوا ہے اور اس سال معاشی حالات کی ناموافقت کی وجہ سے آندھرا پردیش میں تقریباً پانچ سو کاشت کاروں کی خودکشی نے اخبارات و رسائل میں جلی عنوان کا درجہ حاصل کر لیا ہے اور ریاستی اسمبلی سے لے کر پارلیمنٹ تک اس کی گونج سنی جا رہی ہے، پڑوس کی ریاست اڑیسہ میں بھی کسانوں کی خودکشی کے واقعات بکثرت پیش آئے ہیں، ہفتہ میں چار پانچ دن میں اخبارات میں ایسی خبریں مل ہی جاتی ہیں، جن میں خواتین کی خودسوزی اور خودکشی کا ذکر ہوتا ہے، یہ واقعات عام طور پر سسرال والوں کی زیادتی اور پیسوں کے نہ ختم ہونے والے مطالبات کی وجہ سے پیش آتے ہیں، ایسے ماں باپ کی خودکشی بھی لڑکی

باعث نہ بنتی ہو؛ اپنے افلاس و غربت کی وجہ سے اپنی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے سے قاصر ہیں اور ظالم سماج نے ان کو سخت ذہنی تناؤ میں مبتلا کیا ہوا ہے، کچھ واقعات ایسے مقروضوں کے بھی پیش آتے ہیں کہ قرض، سود اور سود در سود نے ان کی ہمت توڑ دی ہے۔

مقامِ افسوس بھی ہے اور لائق حیرت بھی کہ بعض مسلمان بھی اب اس کا شکار ہو رہے ہیں، لائق حیرت اس لئے کہ خودکشی بنیادی طور پر ایمان کی کمزوری یا اس سے محرومی کی وجہ سے کی جاتی ہے، جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہو، یقین کرتا ہو کہ خدا دشواریوں کی سیاہ رات سے آسانی اور امید کی صبح کو پیدا کر سکتا ہے، جو شخص تقدیر پر ایمان رکھتا ہو کہ خوش حالی اور تنگ دستی اور آرام و تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، صبر و قناعت انسان کا فرض ہے اور جو آخرت پر ایمان رکھتا ہو کہ زندگی کے مصائب سے گزرتے ہوئے صابروں کے لئے وہاں راحت و آرام ہے اور زندگی کی آزمائشوں سے راہِ فرار اختیار کرنے والوں کے لئے تنگی، گھٹن اور عذاب، وہ کیسے مشکل وقتوں میں خدا کی چوکھٹ پر اپنی پیشانی رکھنے یا بارگاہِ ربانی میں دستِ سوال پھیلانے اور خدا کی رحمت سے امید رکھنے کے بجائے مایوس ہو کر اپنے آپ کو ہلاک کرے گا؟؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ خودکشی کے اخلاقی اور سماجی نقصانات لوگوں کو بتائے جائیں، سماج میں لوگوں کی تربیت کی جائے کہ وہ تنگدستوں اور مقروضوں کے ساتھ نرمی اور تعاون کا سلوک کریں، گھر اور خاندان میں محبت اور پیار کی فضا قائم کریں اور باہر سے آنے والی بہو کو محبت کا تحفہ دیں، رسم و رواج کی جن زنجیروں نے سماج کو زخمی کیا ہوا ہے، ان کو کاٹنے کی کوشش کریں، شادی بیاہ کے مرحلوں کو آسان بنائیں اور جو لوگ ذہنی تناؤ سے دوچار ہوں اور مشکلات میں گھرے ہوئے ہوں، ان میں جینے اور مسائل و مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کریں، کہ بقول حضرت کلیم:

مشکلیں اور بھی ہیں جل کر مر جانے سے کیا ہوگا
ہوا ہے کام جو ہم سے وہ دیوانوں سے کیا ہوگا

(۲۴ ؍ اپریل ۱۹۹۸ء)

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

۱۲؍ مارچ ۱۹۹۸ء کے روزنامہ ''منصف'' میں شہ سرخی کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ حیدرآباد شہر میں ''اسپرم بینک'' قائم ہو چکا ہے، جہاں مردوں سے مادۂ تولید حاصل کیا جاتا ہے اور اولاد کی خواہش مند بانجھ خواتین کو فروخت کیا جاتا ہے اور ان کے رحم میں اس کو پہنچایا جاتا ہے، ڈاکٹر مادۂ تولید حاصل کرنے میں طبی نقطۂ نظر سے ہر طرح کی احتیاط ملحوظ رکھتے ہیں، جو جرثومات فروخت کرنے والوں کو ایک بار ۲۰۰ روپے قیمت ادا کی جاتی ہے، خبر کے مطابق اب تک اس بینک کو پچاس مستقل عطیہ دہندگان حاصل ہو چکے ہیں اور تین خواتین اس سے حاملہ ہونے کی آرزو پوری کر چکی ہیں۔

حیدرآباد کے لئے تو یہ خبر تازہ ایک انکشاف کا درجہ رکھتی ہے، لیکن ہندوستان میں مغربی تہذیب کے باب الداخلہ ممبئی میں عرصہ پہلے سے ایسے بینک قائم ہیں اور ممکن ہے کہ ملک کے دیگر شہروں میں بھی اس طرح کے ادارے کام کر رہے ہوں، عرصہ پہلے جانوروں کے لئے اس کا تجربہ کیا گیا تھا اور اب جانوروں پر مصنوعی تولید کا یہ طریقہ عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے، بلکہ اب مختلف جانوروں کے اختلاط اور ان کے ذریعہ اچھی نسل کے حصول کا بھی کامیاب تجربہ کیا جا رہا ہے، جس میں دونوں صنف کے جانوروں کی خصوصیات جمع ہوں۔

حیوانات میں نر کا مادۂ تولید مادہ کے رحم تک پہنچایا جائے، اس میں اخلاقی اعتبار سے کوئی قباحت نہیں، اور اسلامی نقطۂ نظر سے بھی جائز ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں میں نسب کی پہچان اور والدین اور اولاد کی شناخت نہیں رکھی، اس لئے اگر ان کا نسب مجہول ہو اور شناخت باقی نہ رہے تو کوئی حرج نہیں، اگر دو ایک الگ جنس کے نر و مادہ کا اختلاط ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نظر نہیں آتا کہ اس میں کوئی اخلاقی برائی نہیں، رسول اللہ ﷺ نے خود بھی خچر

موجود تھے، جو گدھے اور گھوڑی کے اختلاط سے پیدا ہوتے تھے ان کی سواری کی جاتی تھی اور خود آپ ﷺ نے بھی خچر کی سواری فرمائی، یہ شرعی اعتبار سے اس کے جائز ہونے کی دلیل ہے۔

اگر نر و مادہ حلال ہوں تو ان سے پیدا ہونے والا بچہ بھی حلال ہوگا اور اس کا کھانا جائز درست ہوگا، کیوں کہ حیوانات کی شناخت ان کی ماں ہی سے ہے۔ اگر ایک حلال اور ایک حرام ہو تو فقہاء کے ایک گروہ کا خیال ہے'' مادہ حلال ہو تو حلال اور مادہ حرام ہو تو حرام تصور کیا جائے، دوسرا خیال ہے کہ اس کی عادات و خصائل پر فیصلہ ہوگا، کیوں کہ ظاہری طور پر یہی ایک ذریعہ ہے، جس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس جانور کی زیادہ مناسبت کس سے ہے، جیسے کتے اور بکری کے اختلاط سے بچہ پیدا ہو، یہ سامنے کے دانت سے کھائے اور کتے کی طرح بھونکے تو اسے کتا شمار کیا جائے گا اور اگر کنارے کے دانتوں سے کھائے اور اس کی آواز بکری سے مماثلت رکھتی ہو تو حلال ہوگا، تیسری رائے ہے کہ ایسے جانور کو حرام تصور کیا جائے گا۔ کیوں کہ حلال و حرام میں اس بات کو بطور اصول مانا گیا ہے کہ اگر کسی چیز کے بارے میں حلال و حرام کے پہلو جمع ہوں تو حرام ہونے کی ترجیح دی جائے گی اذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام (الاشباہ والنظائر: ۱۰۹) حقیقت یہ ہے کہ یہی تیسری رائے ان میں سے قوی، شریعت کے مزاج سے قریب اور شریعت کے اصول و قواعد سے ہم آہنگ ہے۔

عقل و شعور کی خصوصی صلاحیت کے سوا اگر انسان اور دوسرے جانوروں کے ان اوصاف کا تقابل کیا جائے جو بحیثیت حیوان انسان میں پائے جاتے ہیں تو بڑی مماثلت نظر آتی ہے، دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھو کر محسوس کرنے کی صلاحیت انسان میں بھی ہے اور دوسرے جانوروں میں بھی، خورد و نوش کی ضرورت اور ہضم کا نظام بھی دونوں کے ساتھ ہے، توالد و تناسل کے لئے نر و مادہ کا اختلاط اور تولیدی نظام میں بھی بڑی حد تک یکسانیت ہے، لیکن جو چیز انسان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ عفت و عصمت اور نسب کی شناخت ہے، یہی چیز انسانی معاشرہ میں خاندان کو وجود میں لاتی ہے، نکاح کے ذریعہ مرد و عورت میں قانونی ارتباط بہم پہنچتا ہے، پھر اس سے رشتے بنتے ہیں اور قرابت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔

ہر شریف سماج میں عفت و عصمت اور نسب کی پہچان کو باقی رکھنے کی ضرورت اور اہم تسلیم کیا گیا ہے اور اسی نسبت سے سب سے عظیم تر بے حیائی کو نفرت کی نظر سے دیکھا گیا ہے، عیسائیت میں حضرت مریم کی اور ہندو مذہب میں سیتا کی عفت و عصمت کو اخلاقی نمونہ بنایا ہے۔ اسلام ـــــ جو سب سے محفوظ مذہب ہے اور جس کی تعلیمات قیامت تک کے لئے مشعل ہدایت ہیں ـــــ نے شرک کے بعد سب سے زیادہ جس گناہ کی مذمت کی ہے، وہ زنا ہے اور اس جرم کی اتنی سخت سزا مقرر کی ہے کہ ارتداد کی سزا بھی اس درجہ شدید نہیں، پھر غور کرو تو اسلام کا پورا قانون معاشرت دو باتوں پر مبنی ہے: عفت و عصمت کی حفاظت اور زوجین میں محبت و مودت کی برقراری، طلاق و خلع اور شوہر کے ظلم سے نجات پانے کے لئے فسخ و تفریق کی گنجائش، قانون عدت، پردہ و حجاب کے احکام اور غیر محرم مردوں اور عورتوں کے اختلاط کی ممانعت؛ ان سب کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ انسان حیوانات کی طرح بے نسب نہ ہو جائے اور جانوروں کی طرح شہوت رانی پر کمربستہ نہ ہو۔

انسانی تاریخ میں متعدد ایسے ادوار گزرے ہیں جن میں انسان نے اپنے آپ کو حیوان کی سطح سے بھی پست کر لیا ہے اور شاید شیطان بھی ان کی اخلاقی پستی دیکھ کر عرق آلود ہوا ہوگا۔ ایران میں ۴۸۷ء میں "مزدک" پیدا ہوا، جس نے عورتوں کو آگ، پانی اور چارہ کی طرح مشترک اور تمام انسانوں کے لئے حلال قرار دیا اور ماں بہن کی تمیز بھی اٹھا دی، (الملل والنحل للشہرستانی ۱/۲۴۸ طبع بیروت) طبری کا بیان ہے کہ اس مقصد سے فسق نے ایسا زور پکڑا کہ جو چاہتا اور جس کے گھر میں چاہتا گھس جاتا تھا، نہ باپ اپنی اولاد کو پہچان سکتا تھا اور نہ اولاد اپنے باپ کو۔

(تاریخ طبری ۲/۸۸)

یونان صدیوں تک تہذیب و ثقافت کا مرکز رہا ہے، لیکن یونان کے زوال میں اخلاقی پستی نے بڑا کردار ادا کیا ہے، اخلاقی پستی کا یہ حال تھا کہ پیشہ ور قحبہ گری کے "ہوٹل" بڑے بڑے حکماء، فلاسفہ و ادباء سے غیر متعلق راہ و رسم رکھتے اور ان کے گرد ہر وقت مشاہیر شعراء، ماہرین فنون لطیفہ، مؤرخین اور فلاسفہ کا مجمع لگا رہتا تھا اور اکثر ان کے مکان علمی صحبت کا مرکز ہوتا تھا" (تاریخ اخلاق یورپ ۲/۳۱۱-۳۱۲) یہاں تک کہ اس زمانہ میں سقراط جیسا فلسفی و حکیم

ستی کا واقعہ۔ ملک وقوم کے لئے داغِ ندامت!

یوں تو آج کل ہمارے ملک میں اکیسویں صدی کا بہت چرچا ہے، راجیو گاندھی نے ملک کو عصری تقاضوں کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل کرنے کا نعرہ دیا تھا، لیکن آج تمام ہی قومی قائدین نے اس کو اپنا نعرہ بنالیا ہے، بعض توہم پرست لوگ تو ایسا سمجھنے لگے ہیں کہ گویا اکیسویں صدی شروع ہونے کے بعد شاید کچھ غیر معمولی اور عجوبہ واقعات ظہور میں آئیں گے، بعض لوگوں کے یہاں یہ بحث جاری ہے کہ ۲۰۰۰ء سے اس صدی کا آغاز ہوگا یا ایک سال بعد، اس صدی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ کہی جاتی ہے کہ یہ سائنس اور ٹکنالوجی، علم وتحقیق اور علم وتحقیق کے وسیلے سے خوشحالی اور اقتصادی ترقی کی صدی ہوگی، لیکن کیا واقعی ہم نے فکری اور عملی اعتبار سے ترقی کا سفر جاری رکھا ہے یا ہم فکر ونظر کی تاریکی اور تہذیب وتمدن کی پستی کی طرف واپس لوٹ رہے ہیں، یہ ایک اہم سوال ہے؟

ہم نے یقیناً نیوکلیر بم بنالئے ہیں، دور دراز تک مار کرنے والے میزائل کو وجود بخشا ہے، سمندر کی تہوں میں اتر کر جنگ وجدال کی صلاحیت حاصل کی ہے، سائنس اور تحقیق کے دوسرے شعبوں میں بھی ہم نے اپنے قدم آگے بڑھائے ہیں، لیکن ایک محدود طبقہ تک ہی ہماری کامیابیاں محدود ہیں، ملک کے عام باشندے اور دیہات وقریہ جات میں رہنے والے ہم وطنوں تک ہم علم کی روشنی پہنچانے اور تہذیب وتمدن کی شمع جلانے میں ناکام رہے ہیں، اس کی ایک مثال اکیسویں صدی کی دہلیز پر بھی "ستی" کے واقعات کا پیش آنا ہے، ۱۱ ر نومبر کو اتر پردیش میں موضع ست پروان جو "مہوبا" کے قریب واقع ہے، میں "ستی" کا واقعہ پیش آیا ہے، ذرائع ابلاغ کی

رپورٹ کے مطابق چرن شاہ کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اور مذہبی رسوم یعنی کو آخری رسومات انجام دی گئیں، چرن شاہ نے دلہن کا لباس زیب تن کیا، منہ سنوارا اور بن ٹھن کر آئی اور اپنے شوہر کی شعلہ زن چتا پر کود گئی۔ لوگ اس تماشا کو دیکھتے رہے لیکن اسے بچانے اور روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، چرن شاہ کی لاش اس قدر جل بھن کر راکھ بن گئی کہ پوسٹ مارٹم بھی نہیں کیا جا سکا۔

حالانکہ پولیس نے اسی واقعہ کے بعد اس علاقہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا تاکہ یہ ستی کی ترغیب کا باعث نہ بنے، لیکن لوگوں نے ایک نہیں سنی اور ۱۴ نومبر کی اخباری اطلاع کے مطابق اس وقت تک ۳۰ ہزار ہندو انتہائی عقیدت کے ساتھ اس مقام کا درشن کر چکے ہیں اور ابھی سلسلہ جاری ہے، لوگ اس جگہ ایک مندر بنانا چاہتے ہیں، ہندو عورتیں انتہائی عقیدت کے ساتھ "ستی استھل" پر پھول اور سیندور چڑھانے کے لئے آرہی ہیں، دیہاتیوں کے بیان کے مطابق یہ علاقہ "ستی" کی رسم کے لئے مشہور ہے اور گذشتہ پچاس برسوں میں یہ چوتھا واقعہ ہے، ستی کے مقام پر پوجا کی جاتی ہے اور ہر جمعرات کو میلے لگائے جاتے ہیں۔

سائنس ٹکنالوجی اور علم و تحقیق کے اس عہد میں بھی اس طرح کے واقعات کا پیش آنا نہایت شرمناک بات ہے، مسلمانوں کے اس ملک میں آنے سے پہلے ہندوستان میں "ستی" کا رواج برہمنوں کو چھوڑ کر دوسری ذات کے افراد میں عام تھا، مسلمانوں نے اس بدبختانہ رسم کو مٹانے کی بڑی کوششیں کیں، پھر انگریزوں نے عہد میں ستی کو ممنوع قرار دینے کے لئے مستقل قانون بنا، لیکن اس کے باوجود ملک کے بعض علاقوں خاص کر راجستھان وغیرہ میں ستی کے شدہ شدہ واقعات پیش آتے رہے ہیں، اور بار بار کے روک تھام کے باوجود ابھی بھی اکا دکا ایسے انسانیت سوز واقعات پیش آجاتے ہیں، "ستی" محض ایک رسم نہیں بلکہ ہندو فکر اور قانونِ معاشرت سے اس کا رشتہ جڑا ہوا ہے، عورتوں کے بارے میں ہندو تصور یہ ہے کہ اس کا اپنا مستقل وجود نہیں بلکہ وہ مرد ہی کے وجود کا ایک حصہ ہے اور اس کی حیثیت ملکیت اور جائیداد کی ہے، بیوی گویا شوہر کی جائیداد ہے، اسی

لئے ہندو سماج میں عورتوں کو کوئی میراث نہیں دی جاتی تھی، لڑکیوں کو اپنے نکاح کے بارے میں کوئی اختیار نہیں تھا اور ان کی مرضی کو دخل دیئے بغیر والیان ان کی شادی کر دیا کرتے تھے، نکاح کے بعد طلاق اور علاحدگی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، اور شوہر کے گذر جانے کے بعد بھی ان کے لئے دوسرے نکاح کی گنجائش نہیں تھی، نکاح بیوگان ہندو سماج میں ایسی ناجائز بات تھی کہ ایک ساتھ بود و باش اختیار کرنے کی وجہ سے مسلمان بھی اسے معیوب سمجھنے لگے، ستی کی رسم بھی غالباً اسی فکر سے جڑی ہوئی ہے کہ چونکہ وہ اپنے شوہر ہی کے وجود کا ایک حصہ ہے اس لئے اسے اپنے شوہر ہی کے ساتھ نذر آتش ہو جانا چاہئے، ستی ہونے کو ہندو سماج میں شوہر کے ساتھ کمال وفاداری تصور کیا جاتا تھا، اور اسی لئے اس عمل کو تقدیس و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

اس طرح کے واقعات ہمیں اسلامی تعلیمات کی پاکیزگی، ان کی عقل و فطرت سے ہم آہنگی اور تمام طبقوں کے ساتھ عادلانہ اور منصفانہ رویہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں، اسلام نے مردوں اور عورتوں کے وجود کو "مستقل" تسلیم کیا ہے، (نساء: ۱۲۴، الاحزاب: ۳۵) عورتوں کو میراث میں حقدار بنایا ہے، بیوی، بیٹیاں، ماں ان قرابت داروں میں ہیں جو بہر صورت میراث کی مستحق ہیں، (نساء: ۱۲-۱۱) اگر زوجین میں نباہ نہ ہو سکے تو طلاق کی گنجائش رکھی گئی ہے، (البقرۃ: ۲۲۹) بیوہ عورتوں کے لئے نہ صرف نکاح کو جائز قرار دیا گیا، بلکہ اس کی ترغیب دی گئی، (النور: ۳۲) خود رسول اللہ ﷺ نے جن خواتین سے نکاح فرمایا ان میں اکثر بیوہ عورتیں تھیں، عورت کو اپنی جائیداد میں تصرف کا کامل حق دیا گیا، (نساء: ۱۹) عورتوں کی مستقل حیثیت کو تسلیم کرنا اور نکاح کو ایک باعزت معاہدہ قرار دینا جس میں شوہر و بیوی معاملہ کے دو فریق ہیں نہ کہ ایک مالک اور دوسرا مملوک یا ایک صاحب سامان اور دوسرا سامان اسی بنیاد پر مرد و عورت کے تعلق کا ایسا صاف ستھرا اور واضح تصور ہے جس میں ستی کی کوئی گنجائش نہیں اور شوہر کے ساتھ اپنے آپ کو نذر آتش کر دینے کا کوئی محرک نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندو بھائیوں کو اسلام کا احسان شناس ہونا چاہئے کہ آج عورتوں

کے بارے میں ہندوستان میں جو کچھ قانونی اصلاحات ہوئی ہیں، وہ اسلامی تعلیمات ہی کا اثر ہیں جیسے عورتوں کے لئے حق میراث کا مسئلہ ہو یا ناخوشگوار تعلقات کی وجہ سے طلاق کی اجازت کا یا بیوہ عورتوں کے لئے نکاح کی اجازت کا اور نکاح میں لڑکی کی رضامندی و خوشنودی کا، یہ سب اسلام کے متوازن اور عادلانہ قوانین معاشرت کا نتیجہ ہے، اسی لئے تعلیمی پسماندگی اور اس کی وجہ سے در آنے والی معاشی کمزوری کے باوجود مسلمانوں میں آج بھی اس طرح کے واقعات پیش نہیں آتے، اگر ہمیں سائنس و ٹکنالوجی اور علم و تحقیق کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کی بلندی اور تہذیب و تمدن کی درخشانی کے ساتھ اکیسویں صدی میں قدم رکھنا ہے اور ایک صالح اور باضمیر سماج کی تعمیر کرنی ہے تو ضرورت ہے کہ ہم ایک مذہبی تقاضہ کی حیثیت سے اسلام کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں، جب تک فکر کی اصلاح نہ ہوگی اور قلب و ذہن کی دنیا میں انقلاب نہ آئے گا، اس طرح کے واقعات پیش آتے ہی رہیں گے، جو یقیناً قوم اور ملک کے لئے باعث ندامت اور نشان عار ہوں گے!

(۲۶ نومبر ۱۹۹۹ء)

دختر کشی —— عہد جدید میں

ایک صاحب خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم کفر و جاہلیت میں مبتلا اور بتوں کے پرستار تھے، خود اپنی اولاد کو مار ڈالتے تھے، میری ایک لڑکی تھی، وہ میرے پکارنے سے بہت خوش ہوتی تھی، جب بھی بلاتا دوڑ کر آتی، ایک دن میں نے اسے بلایا، وہ میرے پیچھے پیچھے آئی، میں اسے ساتھ لے کر چلتا رہا، یہاں تک کہ میں ایک محلہ کے کنویں کے پاس آیا، جو کچھ زیادہ دور نہیں تھا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کنویں میں پھینک دیا، اور آخری بات جو میں نے اس کی زبان سے سنی وہ یہ تھی میرے ابا! میرے ابا! یہ سن کر آپ ﷺ پر گریہ طاری ہوا، اتنا روئے کہ ریش مبارک بھی آنسو سے تر ہوگئی، پھر آپ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمانۂ کفر کے گناہوں کو معاف کر دیا ہے، اب نئے سرے سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کرو۔ (سنن دارمی ۱۳۱) اسلام سے پہلے عرب میں اس طرح کے ظالمانہ عمل کا ارتکاب کوئی شاذ و نادر بات نہ تھی، بلکہ کثرت سے ایسے واقعات پیش آیا کرتے تھے۔

اسی لئے قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اولاد کشی اور خاص کر دختر کشی کی مذمت کی ہے، (انعام ۱۹) لوگ فقر و افلاس کے اندیشے سے قتل اولاد کے مرتکب ہوا کرتے تھے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تم سے کم درجہ بھوک اور فاقہ کشی کے خوف سے اس گھناؤنے جرم کے ارتکاب سے منع فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی روزی ہمارے ذمہ ہے نہ کہ تمہارے ذمہ۔ (الاسراء ۳۱، الانعام ۱۵۱) ایک بار آپ ﷺ نے اس سوال پر کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ اول نمبر پر شرک کا نام لیا، پھر والدین کی نافرمانی کا اور اس کے بعد اسی خوف سے اولاد کو مار ڈالنے کا کہ اس کے کھانے کا کیا نظم ہوگا۔ (بخاری)

بعض لوگ ایسے ہوتے تھے جو قتل اولاد کو قربانی تصور کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکتے ہیں، عربوں میں بھی یہ تصور موجود تھا۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس کا ذکر فرمایا ہے اور اس کی مذمت کی گئی ہے۔ (الانعام ۱۳۷) خود آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے اپنے بیٹے کی قربانی کی نذر مانی تھی، جب نذر پوری کرنے کی نوبت آئی تو اپنے دس بیٹوں کو لے کر حرم کعبۃ اللہ میں حاضر ہوئے اور قرعہ نکالا کہ قربانی کے لئے کس کا نام نکلتا ہے؟ اتفاق کہ سب سے چہیتے بیٹے عبداللہ کا نام نکلا، یہ وہی عبداللہ تھے جن کے صلب میں نبوت کا ماہِ تمام چھپا ہوا تھا، عبدالمطلب اس قربانی کے لئے پوری طرح تیار تھے، لیکن قریش نے بڑی خوشامدیں کیں کہ اگر بیٹے کی قربانی کا رواج عام ہو گیا تو اس سے ہم گروہ ہو جائیں گے، چنانچہ زمانۂ جاہلیت کے طریقہ کے مطابق پانسے ڈالے گئے اور بالآخر عبداللہ کے بدلہ سو اونٹ ذبح کئے گئے۔ (السیرۃ النبویہ لابن ہشام ۱:۱۵۳) بچے کی قربانی کے نذر کے بعض دوسرے واقعات بھی حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ایک خاتون نے اس قسم کی نذر کے بارے میں سوال کیا تو آپؓ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو بلکہ اس کا کفارہ ادا کر دو۔ (موطا امام مالک، باب ما لا یجوز من النذور فی معصیۃ اللہ) اس سے ظاہر ہے کہ عربوں کے یہاں ایسی قربانی کوئی نادر واقعہ نہ تھی اور یہ کچھ عربوں ہی پر موقوف نہ تھا بلکہ دوسری قوموں میں بھی انسانی قربانی کا رواج رہا ہے، ہندوستان میں بھی دیوی دیوتاؤں پر انسانی بھینٹ چڑھانے کا رواج تھا اور اس ترقی یافتہ دور میں بھی ایسی خبریں پڑھنے کو مل جاتی ہیں کہ باپ نے اپنی ہی اولاد کو بھینٹ چڑھا دی۔

تاہم فقر و افلاس کی وجہ سے اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے قتل اولاد کے واقعات تو اکا دکا ہوتے تھے لیکن "دختر کشی" کا رواج عربوں میں بہت ہی زیادہ تھا اور اس کے لئے ایسی شقاوتِ قلبی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا کہ جس کو پڑھ کر آج بھی دل کانپ اٹھتا ہے۔ حضرت قیس بن عاصمؓ نے بارگاہِ نبوی ﷺ میں اعتراف کیا کہ وہ اسلام سے پہلے اپنی آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کر چکے ہیں، بلکہ ایک روایت میں تیرہ لڑکیوں کا ذکر ہے۔ (تفسیر ۴:۴۷۸)

دراصل عرب اپنے گھر میں داماد لانے کو شرم و عار کی بات سمجھتے تھے، اسی لئے بیٹی کی پیدائش کا نام سنتے ہی مارے غصہ کے اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا تھا، اس کے سامنے دو ہی راستے ہوتے تھے، یا تو وہ اس متاعِ رسوائی کو اپنے پاس رکھے یا اسے مٹی کے نیچے دفن کردے، (النحل ۵۹) ہندوستان میں بھی راجپوتوں اور بعض دوسری طاقتور قوموں میں لڑکیوں کے دفن کردینے کا رواج تھا اور شوہروں کے ساتھ بیوی کا ستی ہوجانا بھی غالباً اسی تصور کا ایک حصہ تھا۔

گو اسلام سے پہلے بھی اور خود عرب سماج میں بھی بعض ایسے شریف النفس اور نیک طبیعت لوگ موجود تھے جو بے گناہ نومولود بچیوں کو حاصل کرلیتے اور پرورش کرکے ان کو جوان کرتے تھے، پھر اگر ان کے والدین چاہتے تو بچیاں ان کو واپس کردیتے ورنہ خود ہی ان کی پرورش کرتے رہتے، بخاری میں اس سلسلہ میں خاص طور پر زید بن عمرو بن نفیل کا ذکر آیا ہے، (بخاری ۱۰۵۲) لیکن اس کی حیثیت محض شخصی کوششوں کی تھی اور ایسی کوششیں انفرادی طور پر محض دو چار جانوں کے تحفظ کا باعث بن سکتی تھیں، یہ کوششیں اس مقصد میں ذرا بھی بار آور نہیں ہوپاتیں کہ عربوں کے ذہن سے شرم و عار کے اس احساس کو مٹائیں اور ان کو سمجھا سکیں کہ جو شخص اپنی بیٹی کسی کے حوالہ کرتا ہے وہ ذلیل و حقیر نہیں بلکہ وہ اپنے داماد کا محسن ہے، اور ہر مرد کو اپنی بیوی کے والدین کا احسان شناس اور احسان مند ہونا چاہئے۔

لیکن جب پیغمبر اسلام ﷺ رحمت مجسم بن کر تشریف لائے اور کفر و جاہلیت اور اوہام و خرافات کی تہ در تہ تاریکی میں ان پر ہدایت کا چراغ روشن کیا تو آپ ﷺ نے عربوں کے ذہن سے اس تصور کو مٹا دینے میں کامیابی حاصل کی، آپ ﷺ نے بچیوں کو "زحمت" کے بجائے "رحمت" قرار دیا، ان کی پرورش کو آخرت کی نجات کا ذریعہ بتایا، نکاح میں قریب قریب مردوں کے سارے حقوق ان کو عطا فرمائے اور ہر طرح کے اعزاز و احترام سے اس مظلوم طبقہ کو سرفراز کیا، خواتین سے تو آپ ﷺ باضابطہ اس بات کی بیعت ہی لیا کرتے تھے کہ وہ قتل اولاد کا ارتکاب نہیں کریں گی۔

ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ یا تو وہ وقت تھا کہ لوگ اپنی لڑکیوں کو زندہ رکھنا اور ان کی

خراب ہوگا، اخلاقی بے راہ روی پیدا ہوگی، اس لئے کہ اصل میں افزائش نسل کا مدار عورت ہی کی ذات پر ہے اس لئے مطلق شرح پیدائش کم ہوتی جائے گی اور اس کے نتیجے میں مردوں کو عورتوں کی قلت کا سامنا ہوگا، انسان کو خاندانی نظام کے سکون سے محرومی کو گوارا کرنا پڑے گا اور اس سے اخلاقی بے حیائی اور بے شرمی کو فروغ دے گی، جو تصور سے بھی ماورا ہے، خود ہندوستان میں بعض قبائلی اقوام میں عورتوں کی شرح پیدائش میں کمی کی وجہ سے کئی کئی مردوں کی "مشترک بیوی" کا شرمناک رواج موجود ہے، اسی سے دختر کشی کے اس جرم کی سنگینی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اگر ہم صرف والدین کو دختر کشی کی اس "جاہلیت جدیدہ" کا مجرم قرار دیں تو شاید انصاف نہ ہو، بجا طور پر سماج اس کا مجرم ہے اور وہ ظالم سماج جو اپنے لڑکوں کو بازار کے سامان کی طرح اونچی قیمتوں پر فروخت کرتا ہے، جو چاہتا ہے کہ لڑکیوں کے والدین سے ان کی رگ رگ کا آخری قطرۂ خون بھی وصول کرلے، جس کو جہیز و تلک نے جسم و روح کا ایسا پھوڑا بنا دیا ہے کہ جسے کوئی ملک کرید دے، مریض اور جس کی بے دردی و شقاوت اور تشدد پر شدید وحشت بھی شرماتی ہوں، جب تک ہم اس اصل مرض کا علاج کرنے میں کامیاب نہ ہوں، دختر کشی کی اس نئی بدی کو روک نہیں سکتے۔

قرآن مجید نے زندہ درگور کی جانے والی لڑکیوں کی بابت جس انداز سے تنبیہ کی ہے، خدا کا دربار انصاف لگا ہوگا، خدا پوری شان قہاری کے ساتھ جلوہ افروز ہوگا، ناحق قتل کردی جانے والی پھولوں کی طرح معصوم بے گناہ بچیاں لائی جائیں گی، پھر حق تعالیٰ ان سے دریافت فرمائیں گے کہ آخر یہ کس جرم میں قتل کی گئی ہیں؟ بأی ذنب قتلت ؟ (التکویر: ۹) شاید اس وقت ان بچیوں کے قاتل ماں باپ بھی کٹہرے میں کھڑے ہوں گے، وہ ڈاکٹر اور معالج بھی جن کا فریضہ انسانی زندگی کی حفاظت ہے نہ کہ زندگی کا خاتمہ، اور شاید وہ پورا سماج بھی جو بالواسطہ ان بے گناہوں کے قتل میں شریک و سہیم ہے۔

(۲۷ اگست ۱۹۹۸ء)

ایک اہم سماجی مسئلہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن چیزوں کا ضرورت مند بنایا ہے، ان میں سے ایک نکاح بھی ہے، نکاح نسلِ انسانی کی افزائش کا ذریعہ، انسان کی پاکبازی اور عفت وعصمت کی حفاظت کا سب سے مؤثر طریقہ نکاح ہی ہے، اور یہ نوعِ انسانی کے فطری تقاضوں میں سے ہے، دینِ حق کا تقاضا بھی ہے کہ انسان کی فطری ضرورتوں کو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے دائرہ میں رہ کر پورا کیا جائے، اسی لئے انبیاء کے ذریعہ آنے والی ہر شریعت میں نکاح کو نہ صرف جائز قرار دیا گیا؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی، انبیاء جو سب سے برگزیدہ گروہ انسانی ہیں، اور جن کا ایک ایک عمل انسانیت کے لئے اسوہ ہے، انھوں نے نہ صرف نکاح کیا؛ بلکہ بعضوں نے ایک سے زائد نکاح کئے، حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ حضرت حواء کے جوڑے کا ذکر بائبل میں بھی ہے اور قرآن میں بھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام وغیرہ کی ازواج مطہرات کا قرآن اور قرآن سے پہلے کی مذہبی کتابوں میں واضح تذکرہ ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی نہ صرف متعدد نکاح کئے؛ بلکہ نکاح کو اپنی سنت قرار دیا، آپ ﷺ نے فرمایا: من سنتی النکاح "نکاح میرے طریقوں میں سے ہے" (مجمع الزوائد، حدیث نمبر: [illegible]) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پانچ چیزوں کو آپ ﷺ نے انبیاء کی مشترکہ سنت قرار دیا، ان میں ایک نکاح ہے (حوالہ سابق: [illegible]) آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو نکاح کرنے کی استطاعت رکھتا ہو، پھر بھی نکاح نہ کرے، وہ مجھ میں سے نہیں ہے: من کان موسرا لأن ینکح ثم لم ینکح فلیس منی (مجمع الزوائد، [illegible]) جو لوگ بلا عذر تجرد کی زندگی گذارتے ہوں،

آپ ﷺ نے ان کو بدترین لوگ قرار دیا: شرارکم عزابکم (مجمع الزوائد ۴/۲۵۰)

خود قرآن مجید میں بھی نکاح کی تلقین کی گئی، ارشاد ہے

"وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم، ان یکونوا فقراء یغنهم الله من فضله، والله واسع علیم" (النور:)

اور تم اپنے میں سے غیر شادی شدہ لوگوں کا نکاح کردو، اور اپنے غلاموں اور باندیوں میں سے بھی نیک لوگوں کا، اگر وہ محتاج ہیں تو اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی کردے گا، اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے اور جاننے والے ہیں۔

اس آیت میں نکاح کی ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ اس ذہنی گرہ کو بھی کھولنے کی کوشش کی گئی ہے جو عام طور پر نکاح کے بارے میں پائی جاتی ہے کہ اگر نکاح کر دیا جائے تو اس نکاح سے جو خاندان وجود میں آئے گا، اس کی ضروریات کیسے پوری کی جائیں گی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نکاح کی وجہ سے انہیں "غنی" سے سرفراز فرمائے گا، اور ان کی رزق میں وسعت پیدا کرے گا، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین اشخاص کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ پر حق ہے، ان میں ایک وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو پاک دامن رکھنے کی غرض سے نکاح کرے۔ (تفسیر ابن کثیر ۳/۲۸۷)

اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کے نام پر کچھ مذہبی گروہوں نے نکاح سے بے نیازی برتی، جسے "رہبانیت" کہتے ہیں، تو قرآن مجید نے اسے پسند نہیں کیا، بلکہ اسے ایک من گھڑت عمل قرار دیا: ورهبانية ابتدعوها (الحدید: ۲۷) جب اللہ کی بندگی کے لئے یکسوئی کی نیت سے بھی تجرد کی زندگی کو پسند نہیں فرمایا گیا، تو اس لئے تجرد اختیار کرنا اور نکاح میں تاخیر کرنا کیسے روا ہو سکتا ہے کہ اس کے معاشی حالات اور بہتر ہو جائیں؟ مگر افسوس کہ مادیت کی پرستش اور خوب سے خوب تر معاشی معیار کی طلب کے نتیجے میں اس وقت نکاح میں تاخیر کا رجحان عام ہو گیا ہے، بعض نوجوان اصل شباب گذارنے کے بعد

جب عمر میں ڈھلاؤ شروع ہوتا ہے تو نکاح کرتے ہیں، یہ نہایت غیر فطری رجحان ہے، اور اس کے نقصانات بہت زیادہ ہیں، یہ نہ صرف اخلاقی اعتبار سے بلکہ طبی اعتبار سے بھی مضرت سے خالی نہیں، جب وقت بچوں کی تربیت کا آتا ہے تو والدین پر بڑھاپے کے آثار شروع ہو جاتے ہیں، یوں تو موت کا کوئی وقت متعین نہیں لیکن عمر طبعی پر بھی موت آئے تو وہ پرورش کے محتاج بچوں کو چھوڑ کر دنیا سے رخت سفر باندھ لیتا ہے، اور افسوس کا ایک پہلو یہ ہے کہ دیر سے نکاح کرنے کے واقعات زیادہ تر تعلیم یافتہ اور مرفہ الحال خاندان میں پیش آتے ہیں، اس لئے اس کو معاشی مفلوک الحالی کا نتیجہ قرار دینا قرین انصاف نہیں۔

اس سے زیادہ اہم مسئلہ بیوہ اور مطلقہ عورتوں: دوبارہ نکاح کے بعد تجرد سے دو چار ہونے والے مردوں کے نکاح کا مسئلہ ہے، ہندو تہذیب میں عورتوں کے مطلقہ ہونے کا تو تصور ہی نہیں تھا، کیونکہ عورت جب ایک دفعہ کسی مرد سے نکاح کے بندھن میں منسلک ہو جاتی تو پھر اسے ہر قیمت اس کی زوجیت میں رہنا پڑتا، خواہ یہ رشتہ محبت و سکون کی جگہ کی ہوئے نفرت کی آگ میں کیوں نہ تبدیل ہو گیا ہو، لیکن جو عورتیں بیوہ ہو جاتیں اور اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ نذر آتش کئے جانے سے بچ جاتیں، ان کا بھی حال کچھ بہتر نہیں تھا، انہیں دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں تھی، عربوں میں گو ایسا رواج نہیں تھا، لیکن بعض واقعات ایسے پیش آتے تھے کہ شوہر یا اس کے ورثہ غیرت کی وجہ سے یا دل کی جلن میں مطلقہ اور بیوہ عورتوں کو نکاح نہیں کرنے دیتے تھے۔

اسلام نے اس رویہ کو پسند نہیں کیا، اور جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، بن بیوی مردوں اور بن شوہر عورتوں کے نکاح کرنے کا حکم دیا گیا، ایک موقع پر مطلقہ عورتوں کے اولیاء سے فرمایا گیا کہ اگر وہ باہمی رضامندی سے اپنے پہلے شوہر سے نکاح کرنا چاہیں تو رکاوٹ نہ بنو، "فلا تعضلوهن ان ينكحن ازواجهن اذا تراضوا بينهم بالمعروف" (البقرہ ۲۳۲) پھر آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تمہارے لئے پاک و صاف زندگی گذارنے کا ذریعہ ہے: "ذلكم ازكى لكم واطهر" (البقرہ ۲۳۲) اس میں اس بات کی طرف اشارہ

ہے کہ مطلقہ اور بیوہ عورتوں کا نکاح سماج کی پاکیزگی کا ذریعہ ہے، جو لوگ ازدواجی زندگی کے تجربہ سے گذر چکے ہوں، ان کا مجرد رہنا سماج کے لئے زیادہ نقصان دہ اور بگاڑ کا سبب ثابت ہو سکتا ہے، اس حصۂ ربانی میں غالباً اسی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے سماج میں مطلقہ اور بیوہ خواتین کے نکاح کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے، بلکہ بچوں کی پرورش کے نام پر اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہ صحیح سوچ نہیں ہے، عورت ہر مرحلہ میں مرد کی رفاقت و نگہداشت کی محتاج ہوتی ہے، شادی سے پہلے باپ اس کا محافظ ہوتا ہے، شادی کے بعد اس کا شوہر، اور آخر عمر میں اس کی اولاد، اس لئے شوہر ایک عورت کے لئے سکون اور نگہداشت کا ذریعہ ہے، وہ جس طاقت کے ساتھ اپنی ضروریات کا مطالبہ شوہر سے کر سکتی ہے، نہ ماں باپ سے کر سکتی ہے، نہ بھائی بہنوں سے، اور شادی کے بعد اپنے والدین سے اسے ادھوری زندگی گذارنی پڑتی ہے، اس لئے یہ قطعاً مناسب بات ہے کہ اس کی بیوگی اور تجرد کے وقتی غم کو اس کا دائمی حیثیت نہ دیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے جن ازواج مطہرات سے نکاح فرمایا، ان میں صرف حضرت عائشہؓ کنواری تھیں، حضرت زینبؓ مطلقہ تھیں، اور باقی امہات المومنین بیوہ تھیں، خود رسول اللہ ﷺ کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما ابولہب کے بیٹے عتبہ اور عتیبہ سے منسوب تھیں، ابولہب کے کہنے پر ان بدبختوں نے طلاق دے دی، آپ ﷺ نے ان دونوں کو یکے بعد دیگرے حضرت عثمان غنیؓ کے عقد میں دیا، ہندوستان میں بہت پہلے سے بیوہ اور مطلقہ عورتوں سے نکاح نہ کرنے کی رسم چلی آتی تھی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس خراب رسم پر بڑے افسوس کا اظہار کیا ہے اور اپنے خاندان کو اس بری رسم کے ختم کرنے کی وصیت کی ہے، پھر حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور بانیٔ دار العلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس کے خلاف مہم چلائی اور خود اپنے خاندان سے اس کی ابتداء کی، اس طرح مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے نکاح کے معیوب ہونے کا جو ذہن سماج میں پیدا ہو گیا تھا، بحمد اللہ وہ کیفیت تو باقی نہیں رہی، لیکن عملاً اب بھی لوگ اس

سے اجتناب ہی برتتے ہیں، اور بعض عورتیں تو بیس پچیس سال کی عمر میں بیوہ ہو کر پوری زندگی اسی حال میں گذار دیتی ہیں، یہ نہایت ہی قبیح بات اور ظالمانہ رسم ہے، اور پوری قوت سے ختم کرنے کی ضرورت ہے۔

جن مردوں کی بیویوں کا انتقال ہو گیا ہے، ان کے دوبارہ نکاح کرنے کو بھی پسند نہیں کیا جاتا، بعض لوگ تو سن رسیدہ لوگوں کے بیوی کے انتقال کے بعد دوسرا نکاح کرنے کو حرص و ہوس سمجھتے ہیں، اور خود بال بچے والد کے نکاح کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، یہ بھی نارواسوچ ہے، مرد جس قدر جوانی میں بیوی کا محتاج ہوتا ہے، بڑھاپے میں اس سے کچھ کم ضرورت مند نہیں ہوتا، کیونکہ بعض خدمت ایسی ہے جسے بیٹے، بیٹیاں، بہو انجام نہیں دے سکتے، بیوی ہی کر سکتی ہے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ بوقت ضرورت باپ کا نکاح بھی اولاد پر اس کا ایک حق ہے، کیوں کہ یہ اس کی خدمت میں شامل ہے، ہاں! یہ ضرور ہے کہ نکاح میں عمر کے لحاظ سے توازن ہونا چاہئے۔

یہ ایک اہم سماجی مسئلہ ہے اور ضرورت ہے کہ خطباء، مقرروں سے اور سماجی اصلاح کی تنظیمیں اپنے پلیٹ فارم سے ان قبیح رسموں کے ازالہ کی فکر کریں، کہ یہ بے سہارا خواتین کو سہارا فراہم کرنے کی نیک کوشش ہوگی!!

(۲۵ رجنوری ۲۰۰۲ء)

جہیز کی ظالمانہ رسم اور ہماری ذمہ داریاں

پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی اس دنیا میں بعثت کا مقصد جہاں مخلوق کو اس کے خالق سے جوڑنا تھا، وہیں یہ بھی تھا کہ انسان نے اپنے آپ پر خود ساختہ رسم و رواج کا جو بوجھ رکھ لیا ہے، اس کو اس سے آزاد کیا جائے "وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ" (الاعراف: ۱۵۷) چنانچہ اسلام سے پہلے لوگوں نے بطور خود جو مشکل قوانین اپنے آپ پر مسلط کر لئے تھے، قرآن نے ان کو دور فرمایا، اور ایسے احکام دیئے جو انسانی مصلحت سے ہم آہنگ بھی ہیں، اور ان کے لئے قابل برداشت بھی، اسی لئے قرآن نے بطور اصول یہ بات کہہ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی شخص کو اس کی قوت اور گنجائش کے لحاظ سے ہی احکام کا مکلف کرتے ہیں: "لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" (البقرۃ: ۲۸۶) نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ خدا یہ نہیں چاہتا کہ اپنے بندوں کو حرج اور تنگی میں مبتلا کرے، بلکہ وہ تو سہولت و آسانی اور کشائش و فراخی چاہتا ہے "يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" (البقرۃ: ۱۸۵)۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے عبادات کو آسان رکھا ہے، اور اللہ کی بندگی کے سیدھے سادے بے خرچ کے اور کم خرچ کے طریقے رکھے ہیں، معاملات کو اللہ نے اس سے بھی زیادہ آسان رکھا ہے، اور جیسے اللہ نے اپنے تکوینی نظام میں ایسی چیزوں کو جو مخلوق کے لئے ناگزیر ہیں، وافر مقدار میں رکھا ہے، اور بے قیمت وبے محنت فراہم کی ہیں، جیسے پانی اور ہوا، اسی طرح نظامِ شریعت میں بھی انسانی زندگی کی فطری ضروریات کو آسان رکھا گیا ہے، ان ہی ضروریات میں ایک نکاح ہے، نکاح انسان کی فطری ضرورت ہے، جس سے

ایک طرف نسل انسانی کی افزائش متعلق ہے، اور دوسری طرف اخلاق و کردار اور قلب ونگاہ کی حفاظت، اسی لئے اسلام میں نکاح کی بڑی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، آپ ﷺ نے نوجوانوں کو تلقین فرمائی کہ بشرطِ قدرت وہ جلد نکاح کر لیا کریں، لڑکیوں کے اولیاء سے فرمایا کہ مناسب رشتے ہاتھ آ جائے تو شادی میں تاخیر نہ کی جائے، آپ ﷺ نے نکاح کو اپنی اور انبیاء سابقین کی سنت قرار دیا، اور تجرد کی زندگی کو ناپسند فرمایا۔

نکاح کو آسان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حلال کو آسان کیا جائے تو حرام سے بچنا بھی آسان ہوگا، اور اگر حلال کو دشوار کر دیا جائے تو حرام سے بچنا بھی دشوار ہوگا، چنانچہ جن ممالک میں نکاح کی شرح کم ہے، اور تجرد کی زندگی گذارنے والوں کا اوسط زیادہ ہے، وہاں زنا اور فواحش کی کثرت ہے، وقتی سکون حاصل کرنے کے لئے منشیات کا استعمال عام ہے، خاندانی نظام بکھر چکا ہے، اور برائیاں ایک سیلاب بلا بن کر سماج کے رگ وریشہ میں سما گئی ہیں، اس لئے کوئی بھی ایسی بات جو نکاح کا راستہ روکنے والی ہو اور لڑکوں یا لڑکیوں کو تجرد کی زندگی پر مجبور کرتی ہو سماج کے لئے سم قاتل ہے۔

آج جو چیزیں شادی بیاہ کے معاملہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں، ان میں سرفہرست جہیز اور گھوڑے جوڑے کا مسئلہ ہے، اس رواج نے سماج کو ناقابل تلافی نقصان پہونچایا ہے، اس کا سب سے شرمناک پہلو جہیز کے لئے شادی شدہ عورتوں کو جلانے اور ہلاک کرنے کے واقعات ہیں، یکم اگست ۱۹۹۱ء کی بی۔بی۔سی کے ایک نشریہ کے مطابق ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۱ء میں گیارہ ہزار سے زیادہ ہندوستان میں جہیزی اموات کے واقعات ہوئے ہیں، ۱۹۹۳ء میں سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ہر دن جہیز کے مسئلہ کی وجہ سے سترہ اموات واقع ہوئی ہیں، ۱۹۹۷ء میں چھ ہزار سے زیادہ جہیزی اموات کے واقعات ہوئے، ۱۹۴۷ء سے چالیس سال کے عرصہ میں بہتر ہزار نوجوان عورتیں ہندوستان میں جہیز کی نذر آتش کی وجہ سے ماری گئی ہیں۔ (دیکھئے: ماہنامہ جامعہ، سبیل پور، جلد: ۸، شمارہ: ۱۰، صفحہ: ۲۵-۲۶)

جہیز کے اس ناروا رسم ورواج نے جسم فروشی کو بھی بڑھاوا دیا ہے، ایک سروے کے مطابق ملک میں گیارہ سو ایسے علاقے ہیں جو جسم فروشی کے لئے بدنام ہیں، تیس لاکھ

عورتیں پیشہ ورانہ طور پر کسبِ زندگی میں مبتلا ہیں، اور ان کے بچوں کی تعداد ایک دس لاکھ ہے۔ سروے کے مطابق ہر سال پچیس ہزار لڑکیاں اس دھندہ پیشہ میں داخل ہوتی ہیں۔ (سہ روزہ دعوت، نئی دہلی ۱۶ اپریل ۱۹۹۹ء) ___ اسی طرح لڑکیوں کی قبل از پیدائش قتل کا سلسلہ بھی روز افزوں ہے، اسی لئے جنوری ۱۹۹۶ء میں دورانِ حمل جنس کی شناخت کی غرض سے الٹرا ساؤنڈ مشین پر پابندی عائد کی گئی لیکن کتنے ہی جوڑے ہیں، جو اس پابندی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ چنانچہ ہندوستان میں ہر سال ایک کروڑ بارہ لاکھ اسقاطِ حمل کے واقعات ہوتے ہیں، اور ان واقعات میں ہر سال تین ہزار عورتیں موت کا شکار ہوجاتی ہیں۔ (اسلامی نظامِ معاشرت اور ہندوستانی سماج، مجیب غوری، صفحہ ۳۳) یہ اسقاطِ حمل کے واقعات زیادہ تر ناجائز حمل اور قبل از وقت لڑکیوں کی شناخت سے متعلق ہیں۔

راجستھان کے اضلاع باڑمیر، جیسلمیر نیز ملک کے بعض دوسرے علاقوں میں پیدائش کے بعد بھی زندہ رہی روز کے اندر لڑکیوں کو زہر کھلا کر یا کسی دوسری طرح مار ڈالنے کا رواج ہے۔ چنانچہ راجستھان کے ضلع باڑمیر کے دیوارا گاؤں میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ ۱۹۹۹ء میں وہاں ایک سو دس برسوں کے بعد ایک بارات آئی (سہ روزہ دعوت، نئی دہلی ۳/ اکتوبر ۱۹۹۹ء) ___ کیا اس جدید جاہلیت نے قدیم جاہلیت کو بھی شرمسار نہیں کر دیا ہے؟!

یہ قاتل، تخریب کار رجحان اور لڑکیوں کے قتل وغیرہ کے واقعات کے لئے ایک اہم محرک یہی جہیز اور گھوڑے جوڑے کی بلا ہے۔ ایک طرف ملک میں غریبوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، اور دوسری طرف ایک طبقہ دادِ عیش دے رہا ہے اور اس عیش کے اظہار و نمائش میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش ہے۔ ممبئی کے والنکھیڑے اسٹیڈیم میں ۱۹۹۰ء میں ایک تقریبِ شادی منعقد ہوئی، جس میں تیس ہزار لوگوں نے شرکت کی، اور بتایا جاتا ہے کہ ہیرے جواہرات کے ایک تاجر نے اسی ممبئی میں اپنی بیٹی کی شادی پر تیس کروڑ روپے خرچ کئے۔ (سہ روزہ دعوت، نئی دہلی ۲۰/ اکتوبر ۱۹۹۸ء) انا ڈی ایم کے قائد جے للیتا کے منہ بولے بیٹے کی شادی کی مدہوش کر دینے والی تقریبات اور روشنی اور آواز کا سیلاب شاید ابھی تک لوگوں کو یاد ہو، بعض ایسی شادیاں

بھی اخبارات کے صفحات پر آچکی ہیں جن میں پورا ہوائی جہاز شادی کے لئے ریزرو کیا
گیا ۔ ایک ایسا ملک جس میں لاکھوں انسان بھوکوں پیٹ سو جاتے ہوں، ہزاروں ہزار
بے دوا مریض اپنی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس لئے جان دے دیتے ہوں کہ ان کے پاس دوا
وعلاج کے لئے کوئی پیسہ نہیں، ایسے سماج میں ایک طبقہ کا اس طرح داد عیش دینا انسانیت
کے ساتھ کیسا مذاق ہے؟؟

اسلامی نقطۂ نظر اس سلسلہ میں بالکل واضح ہے، اسلام نے نکاح میں تمام مالی
ذمہ داریاں مردوں پر رکھی ہیں، مہر اس کے ذمہ ہے، ولیمہ اسے کرنا ہے، بیوی کے نفقہ کی
ذمہ داری اس پر ہے، بچوں کی پرورش کا بوجھ اسے برداشت کرنا ہے، خود کماتا ہے اور
پورے گھر کی ضروریات پوری کرتا ہے، اسی باعث تو اللہ تعالیٰ نے مرد کو "قوام" یعنی
سربراہ خاندان بنایا ہے، اس لئے مرد کا عورت سے نکاح کے موقع پر یا نکاح کے بعد کچھ لینا
درحقیقت ننگ وعار کی بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے خود ایک سے زیادہ نکاح فرمائے،
اپنی صاحبزادیوں کا نکاح کیا، اور آپ کے جاں نثار رفقاء کے بہت سے نکاح آپ کے
سامنے ہوئے، لیکن نہ جہیز، اور نہ مردوں کی طرف سے کوئی مطالبہ، حضرت خدیجہؓ کا
حضرت زینبؓ کو اپنے گلے کا ہار دینے کا ذکر ملتا ہے، لیکن ایک تو یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے،
دوسرے اس کی صراحت نہیں کہ نکاح کے وقت ہی ہار دیا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ
کے لئے کچھ ضروری اثاثہ بستر، تکئے، مشکیزہ وغیرہ بنوائے، لیکن حدیث وسیرت کی کتابوں
میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ سب کچھ خود حضرت علیؓ کی زرہ فروخت کرنے کی
سے مہیا کیا گیا تھا، (دیکھئے شرح مواہب ۲:۳) مشہور ہے کہ اردو زبان میں سیرت کی
پہلی کتاب مفتی عنایت احمد کاکوروی کی "تواریخ حبیب الٰہ" ہے، انہوں نے بھی یہی
لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کے زرہ کی قیمت میں سے کچھ آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ
کو دیا کہ خوشبو خرید کر لائیں، اور باقی حضرت ام سلمہؓ کو کہ حضرت فاطمہؓ کے لئے گھر کی
ضروریات خرید کی جائیں، (تواریخ حبیب الٰہ: ۳۳) فقہاء کے یہاں قریب قریب
صراحت ملتی ہے کہ نکاح کے موقع پر عورت سے کوئی فائدہ حاصل کرنا "رشوت" کے حکم میں

ہے، اور رشوت کا گناہ اور ظلم ظاہر ہے کہ اس کا لینا بھی حرام ہے، اور ضرورتِ شدیدہ کے بغیر اس کا دینا بھی، اور اگر لے لیا ہو تو واپس کرنا واجب ہے، رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت فرمائی ہے، تو کس قدر محرومی کی بات ہے کہ ایک سنت نبوی کو انجام دیتے ہوئے انسان اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی لعنت کا طوق بھی اپنے گلے میں ڈال لے۔

حقیقت یہ ہے کہ جہیز اور گھوڑے جوڑے کا مسئلہ نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے بھی نہایت سنگین مسئلہ ہے، اور سنگین تر ہوتا جا رہا ہے، ہم مسلمانوں کو دین عدل اور شریعت عادلہ کے حامل ہونے کی حیثیت سے اس کے مقابلہ کے لئے آگے بڑھنا چاہئے، اور سماج کو اس سے نجات دلانے کی کوشش کرنی چاہئے، نہ یہ کہ وہ خود ظلم و جور کے اس سمندر میں کود پڑیں اور دوسری قوموں کی اس ظالمانہ رسم کو اپنے سماج میں لے آئیں۔ جیسے ایک زمانہ میں بعض بزرگوں نے نکاح بیوگان کی تحریک چلائی تھی، کیونکہ مسلمان ہندو سماج سے متاثر ہو کر بیوہ عورتوں کے نکاح سے گریز کرنے لگے تھے، اسی طرح آج بھی ایک ایسی مہم کی ضرورت ہے، جو رسم جہیز کو مٹانے کے لئے برپا کی جائے، اور نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ انسانی بنیادوں پر تمام اقوام میں اس پیغام کو لے کر پہونچا جائے۔

اس سلسلہ میں دو طبقوں کی ذمہ داریاں سب سے زیادہ ہیں، ایک تو علماء اور مشائخ کی، کہ وہ ایسی تقریبات میں شرکت سے گریز کریں، جن میں لین دین کی بنیاد پر نکاح کیا گیا ہو، اور غالباً ان کا یہ فعل منشأ شریعت کے بھی مطابق ہوگا، دوسرے قوم کا متمول اور صاحب ثروت طبقہ جو اسراف اور فضول خرچی پر قادر ہے، اس کے باوجود وہ شادی بیاہ کی تقریب کو سادگی سے انجام دے، تو فضول خرچی کی یہ دوڑ کم ہوگی، اور متوسط اور غریب گھرانوں کے لئے اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے گا، سال ڈیڑھ سال پہلے شہر کے ایک بڑے مسلم صنعت کار نے سادہ طریقہ پر اپنی لڑکی کی شادی کی رسم انجام دی، اخبارات نے بھی اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا، اور مختلف حلقوں پر اس کا اچھا اثر پڑا ___ کاش! ہم سماج کی اس مجبوری کو محسوس کریں اور حقائق کی تلخیوں کو نہ صرف گوارا کریں، بلکہ ان کو سامنے رکھ کر اپنے حالات میں کچھ انقلابی تبدیلیاں لائیں۔ (۲۷/اکتوبر ۲۰۰۰ء)

لڑکوں کی تجارت

دنیا میں کتنی ہی چیزوں کی تجارت ہوا کرتی ہے، معمولی سے معمولی اور قیمتی سے قیمتی ہیرے موتی سے لے کر ریت اور مٹی کے ڈھیر بلکہ غلاظتوں تک کی خرید وفروخت کا سلسلہ جاری ہے، کسی زمانہ میں انسانوں کی بھی تجارت ہوا کرتی تھی، اب بھی سنا ہے کہ افریقہ کے بعض غریب ممالک میں انسان خریدے اور بیچے جاتے ہیں، گاہے گاہے ہندوستان میں بھی ایسی خبریں منظر عام پر آجاتی ہیں کہ فلاں مقام پر غریب اور فاقہ کش ماں باپ نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کچھ پیسوں کی عوض فروخت کر دیا، یقیناً خون جگر پلا پلا کر بچوں کی پرورش کرنے والے ماں باپ اپنے ہونٹوں پر خون کے آنسو [illegible] ان بچوں کو قدموں پر نچھاور کرتے ہوئے رخصت کرتے ہوں گے۔

لیکن انسانی تجارت کی ایک اور صورت ہے، جو اس وقت ہمارے مہذب لوگوں کے درمیان رائج ہے، جس میں انسان اپنے لڑکوں کو آپ فروخت کرتا ہے اور فروخت کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں حسرت وافسوس کے آنسو نہیں بلکہ خوشی کے آنسو ہوتے ہیں، دل حسرت ویاس کی چوٹ سے ٹوٹتا نہیں بلکہ حسین آرزوؤں کے تصور سے اچھلتا اور کودتا ہے، یہ عجیب منڈی ہے جہاں بڑے بڑے تعلیم یافتہ، اسی طرح ثروت والے اعلیٰ عہدوں پر فائز خوشی خوشی اپنے لڑکوں کا سودا طے کرتے ہیں، اور ان کی تعلیم، معاشی امکانات، خاندانی پس منظر، یہاں تک کہ شکل وصورت اور آباء واجداد کی شرافت کی دہائی دے کر دام لگاتے اور زیادہ سے زیادہ قیمت کے خواستگار ہوتے ہیں، انہیں اپنے لڑکوں کو فروخت کرنے اور ان کی جوانی کی قیمت لگانے میں نہ کوئی شرم ہوتی ہے، نہ کوئی عار۔

آپ سوچیں کہ یہ کون سی منڈی ہے؟ کیا کوئی ماں باپ اپنے لڑکوں کو بیچ بھی سکتا ہے؟ کہیں انسانوں کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے، کیا عہد غلامی پھر واپس آ گیا ہے؟ ——

لیکن آپ کو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے، ہمارا پورا سماج انسانی تجارت کا مرکز بنا ہوا ہے، ہر گھر میں ایک دوکان ہے، اور ہر خاندان میں بکنے اور بکانے والے ہیں، —— کیا لڑکی والوں سے گھوڑے جوڑے کے نام پر رقم وصول کرنا، ان سے جہیز کا مطالبہ کرنا، اپنے مدعوین کو ان کے سر تھوپ دینا اور ان سے منہ مانگا کھانا طلب کرنا، تجارت اور اپنے لڑکے کی قیمت لگانا نہیں ہے؟ قیمت روپیوں میں بھی ادا کی جاتی ہے، سامان واسباب کے ذریعہ بھی، اور ہوٹلوں میں شکم پروری کے ذریعہ بھی، یہ سب قیمت کے مختلف عنوان اور الگ الگ انداز ہیں، لڑکا اور اس کے والدین ان تمام طریقوں سے لڑکے کی قیمت وصول کرتے ہیں، اور اس کی جوانی کا منہ مانگا دام پاتے ہیں، اس کے تجارت ہونے میں کیا شبہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک ہی ماں باپ سے مرد وعورت دونوں کو پیدا کیا ہے، جیسے مردوں کے حقوق ہیں، ویسے ہی عورتوں کے، بلکہ قرآن نے کہا ہے کہ اصولی طور پر مرد وعورت دونوں حقوق میں برابر ہیں "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ" (البقرۃ: ۲۲۸) البتہ صنفی صلاحیتوں کے تفاوت کے اعتبار سے تقسیم کار ہے، اور بعض ذمہ داریوں میں مرد وعورت کے درمیان فرق رکھا گیا ہے، مرد کو سربراہ خاندان قرار دیا گیا "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ" (النساء: ۳۴) اور مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فوقیت دی گئی، لیکن یہ فوقیت محض مرد ہونے کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ مردانہ فرائض اور بحیثیت سربراہ خاندان خرچ کرنے کی وجہ سے ہے، "وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ" (البقرۃ: ۲۲۸)

غرض مرد کو جو فضیلت اور برتری دی گئی ہے وہ اس وجہ سے کہ دوہری ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتا ہے، اسی لئے کسب معاش کی ذمہ داری مرد سے متعلق کی گئی "وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ" (الجمعۃ: ۱۰) اور امور خانہ داری کو عورتوں سے متعلق کیا گیا، اور ان سے کہا گیا کہ وہ گھر میں رہا کریں "وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ" (الاحزاب: ۳۳) کہ ان کی عزت

دونوں صورتوں میں اپنے مالی مفادات کو حاصل کرتا ہے، ابھی چند دنوں پہلے حیدرآباد میں خواتین کی تنظیم تحفظ شریعت کمیٹی نے اپنے ”شعبہ“ ”وومن ہیلپ لائن“ کے تحت نفیس گارڈن میں ایک پروگرام رکھا تھا، جس میں شریعت اور سنت کے مطابق نکاح کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں اور ان کے اولیاء کو جو رشتے کے خواہشمند ہوں، دعوت دی گئی تھی، تاکہ ایسے لوگ اس عزم کے ساتھ باہم رشتے طے کریں کہ وہ مسنون طریقہ پر بغیر لین دین کے تقریب نکاح کو انجام دیں گے، اس کیمپ کے افتتاح کی ذمہ داری اس حقیر پر رکھی گئی تھی، میں جب پہونچا تو اس وقت تک دو سو سے کچھ اوپر رشتے کے خواہشمند حضرات اپنے نام رجسٹرڈ کرا چکے تھے، لیکن ان میں بیس رشتے لڑکے والوں کی طرف سے تھے، اور باقی سب لڑکی والوں کی طرف سے، گویا نوے فیصد رشتوں کی پیش کش لڑکی والوں کی طرف سے تھی، اور دس فیصد لڑکے والوں کی طرف سے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے سماج کے مزاج میں کتنا بگاڑ آچکا ہے، اور شریعت اور دین کو کس قدر پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے نکاح کے موقع پر مہر کے علاوہ جو مطالبات کئے جاتے ہیں، وہ رشوت کے حکم میں ہیں، رشوت کا لینا تو حرام ہے ہی، شدید ضرورت کے بغیر رشوت کا دینا بھی حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجی ہے، آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ دونوں جہنمی ہیں، اس طرح نکاح کے موقع سے مطالبہ کرنے والے تو اپنے لئے جہنم خریدتے ہی ہیں، اور اللہ کی لعنت کا طوق اپنے گلے میں لٹکاتے ہی ہیں، جو لوگ دینے پر مجبور نہ ہوں وہ بھی اپنے لئے جہنم اور خدا کی لعنت خرید رہے ہیں، مجھے تو سب سے زیادہ افسوس لڑکے کے بوڑھے والدین اور دوسرے اعزہ کی کم بختی پر ہوتا ہے، کہ زیادہ تر وہی مطالبات کی فہرست بناتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں، حالانکہ جب یہ سامان گھر میں آتا ہے یا رقم لڑکوں کے ہاتھوں ملتی ہے تو خود ان کو بہت کم ہی اس سے استفادہ کا موقع بہم پہونچتا ہے، زیادہ تر گھر میں آنے والی بہو اور اس کا شوہر ہی نفع اندوز ہوتا ہے، لیکن ناحق قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے والدین اپنے عمر

کے آخری لمحات میں جس کو توبہ و استغفار کے لئے وقف ہونا چاہئے تھا، وہ رنج اور لعنت خداوندی بصد مسرت اور بہ ہزار شوق خرید کرتے ہیں، کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی کم نصیبی بلکہ بد نصیبی ہو سکتی ہے؟

اگر کسی شخص سے رشوت لے لیا ہو تو جب اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ وہ اسے واپس کر دے، اسی لئے جن لوگوں نے مطالبہ کے ذریعہ کوئی رقم یا سامان حاصل کیا ہے تو اس کا یا اس کی قیمت کو واپس کر دینا شرعاً واجب ہے، مانگنا چاہے صراحتاً ہو یا اشارۃً، براہِ راست ہو یا بالواسطہ سب کا ایک ہی حکم ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مطالبہ تو نہیں کیا اور سامان کی فہرست تو پیش نہیں کی لیکن کسی دولت مند گھرانے میں یہ سمجھ کر رشتہ طے کیا کہ اگر وہ نہیں تو ایک لاکھ تو کہیں نہیں جائیں گے، اتنا تو وہ بغیر مانگے ہی دے دے گا، یہ بھی رشوت کے ہی حکم میں ہے، کیوں کہ فقہاء نے ایک اصول مقرر کیا ہے کہ جو چیز بطور شرط کے طے نہ کی جائے، لیکن عرف و رواج کے تحت لی جائے، تو وہ بھی شرط لگانے کے حکم میں ہوگا، المعروف عرفاً کالمشروط شرعاً، ہاں! اگر انکار و نفی کے باوجود لڑکی والے اپنی طرف سے دیں تو یقیناً اس دائرہ میں نہیں آئے گا۔

اگر نکاح کی تقریب مسجدوں، دینی جلسوں اور مذہبی اجتماعات میں رکھی جائیں، علماء اور ارباب دین سے نکاح کے خطبات پڑھوائے جائیں، مجلس نکاح میں ایمان افروز اور روح پرور بیانات رکھے جائیں، لیکن اندرونی طور پر سودے بازی بھی کی جائے اور چھپے ہاتھوں لین دین کا معاملہ بھی طے کیا جائے تو یہ تو نفاق اور گناہ پر ظاہری نیکی کا دبیز غلاف چڑھانا اور دین کے پردہ میں بے دینی کو چھپانا ہے، جو یقیناً کھلی ہوئی بے دینی سے بھی زیادہ مذموم اور ناپسندیدہ ہے۔

لین دین کا ایک نفسیاتی اثر یہ پڑتا ہے کہ اگر کوئی لڑکی مسنون طریقہ عقد کے ذریعہ نکاح میں لائی جائے تو لڑکی اور اس کے والدین کے اندر احسان مندی اور احسان شناسی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، وہ اپنے سسرال کو اپنا محسن تصور کرتی ہے، وہ سمجھتی ہے کہ وہ ایک ماں باپ سے جدا ہو کر دوسرے ماں باپ کے گھر پہنچی ہے، اس میں اپنے

شوہر، ساس، سسر اور سسرال کے بڑوں کے تئیں محبت اور خدمت کے جذبات ہوتے ہیں، اور جب قرضے لے کر اس کے والدین لڑکی والوں کا خون جگر اور عرق جبیں لہو نچوڑ کر اسے اپنے گھر لاتے ہیں، اس بہو میں احسان مندی اور جاں نثاری کے بجائے نفرت اور خود غرضی کے جذبات پنہاں ہوتے ہیں، اور یہ ایک فطری بات ہے، اگر کوئی شخص آپ کو پانچ روپیہ کی کوئی چیز تحفۃً پیش کرتے تو آپ یقیناً اس کے شکر گذار ہوں گے، اور آپ کے دل میں قدردانی کا جذبہ پیدا ہوگا، اور اگر آپ کسی سے پانچ روپے میں کوئی چیز خرید کریں تو آپ اسے محسن تصور کرنے کے بجائے اپنے آپ کو محسن سمجھیں گے، اس لئے کہ تاجر خریدار کا احسان مند ہوتا ہے نہ کہ خریدار تاجر کا، اس لئے جس لڑکی والوں کے سرپرست نے دولہا کی قیمت ادا کی ہے، آخر وہ اس مرد یا مرد کے جس خاندان کی احسان مند کیوں کر ہو، جس کی قیمت ان لوگوں نے اپنا خون جگر بیچ کر ادا کی ہوں، اس لئے آج کل یہ شکایت عام ہے کہ اب بہو گھر میں آتی ہے وہ خدمت و اطاعت کے جذبے سے خالی و عاری ہوتی ہے، اور گھر سے متعلق فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں کوتاہ۔

(۱۶ اگست ۲۰۰۲ء)

عورتوں کا حق میراث

اسلام کا معاشی اور مالی نظام اس اصول پر مبنی ہے کہ ایک ہی شخص کے پاس دولت کا ارتکاز نہ ہو، دولت زیادہ سے زیادہ تقسیم ہوتی رہے تاکہ غریبوں اور دولت مندوں کے درمیان معاشی فاصلہ کم ہو، اور حد سے زیادہ دولت کی وجہ سے انسان کے اندر جو اخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہیں اور ایک ہی شخص کے پاس دولت کے ارتکاز کی وجہ سے سماج کے ایک طبقہ میں احساس محرومی کی شدت اور دہشت گردی کا جو رجحان نشو ونما پاتا ہے، اس کا سد باب ہو سکے۔ تقسیم دولت کا جو نظام اسلام نے بنایا ہے اس میں ترکہ و میراث کے قانون کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اس میں خود اس شخص کے ارادہ و اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے، اگر مرنے والا شخص اپنی دولت کو کسی ایک ہی وارث کے حق میں مرتکز کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔

اسلام سے پہلے دنیا کے مختلف مذاہب اور نظام ہائے قانون میں قانون میراث بہت ہی غیر متوازن تھا، بعض مذاہب میں صرف لڑکوں کو حصہ ملتا تھا، لڑکیاں میراث سے محروم تھیں، بعض مذاہب میں صرف پہلوٹھا بیٹا پورے متروکہ کا حق دار سمجھا جاتا تھا، اسلام نے اس ناانصافی اور بے اعتدالی کو ختم کر کے ایک نہایت متوازن اور عادلانہ نظام میراث عطا کیا ہے، جس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی ترکہ کا حق دار بنایا گیا ہے، البتہ چونکہ دونوں کی مالی ذمہ داریوں میں تفاوت ہے، اس لئے دونوں کے حق میراث میں بھی فرق رکھا گیا ہے، اسی طرح ایک ہی درجہ کے قرابت داروں کے حقوق مساوی رکھے گئے ہیں، چنانچہ لڑکا بڑا ہو یا چھوٹا، دونوں کا حصہ میراث برابر ہوگا۔

قانون میراث کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ فقہ اسلامی کے بنیادی ماخذ چار ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ ان میں پہلے تینوں ماخذ اصل ہیں، اور جن مسائل میں ان کی رہنمائی موجود نہ ہو وہاں قیاس و اجتہاد سے مدد لی جائے گی۔ میراث کا قانون وہ اہم قانون ہے کہ یہ براہِ راست قرآن و حدیث کی صراحتوں اور امت کے اجماع و اتفاق سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء (آیت ۱۱، ۱۲، ۱۷۶) میں تفصیل سے میراث کے احکام کا ذکر فرمایا ہے، نیز احکام میراث کا ذکر کرتے ہوئے خاص طور پر متنبہ کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا حصہ ہے، اور اللہ تعالیٰ باخبر بھی ہیں اور حکمتوں سے واقف بھی "فريضة من الله، إن الله كان عليما حكيما" (النساء: ۱۱) یعنی میراث کے احکام سراسر علم و حکمت پر مبنی ہیں، اس لئے چاہے تمہاری عقل میں آ سکے یا نہ آ سکے، اس پر عمل کرو، اور جان رکھو کہ یہی حکمت و مصلحت کے عین مطابق ہے!

آیت میراث جس واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوئی، وہ بھی نہایت اہم ہے، حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ باہر نکلے، "اسواف" نامی مقام پر ہمارا گذر ایک انصاری خاتون کے پاس سے ہوا، وہ اپنی دو لڑکیوں کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، اور عرض کیا کہ ان کے والد غزوۂ احد میں آپ کے ساتھ شہید ہو چکے ہیں، اور ان کے چچا نے شہید کا کل مال حاصل کر لیا ہے، ان کے لئے کچھ نہیں چھوڑا، اور صورت حال یہ ہے کہ جب ان کے پاس کچھ مال ہی نہ ہوگا تو کوئی شخص ان سے نکاح کو بھی تیار نہ ہوگا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں فیصلہ فرما دیں گے، چنانچہ سورۂ نساء کی آیت میراث نازل ہوئی، آپ ﷺ نے ان خاتون کو اور ان یتیم لڑکیوں کے چچا کو طلب فرمایا اور ان سے کہا کہ شہید کے ترکہ کا دو تہائی ان دونوں لڑکیوں اور آٹھواں حصہ شہید کی بیوہ یعنی ان دونوں بچیوں کی ماں کو دے دو، اس کے بعد جو بچ جائے وہ تمہارا ہے۔ (ابوداؤد، کتاب الفرائض)

آیت میراث میں اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے میراث کے حق داروں کا ذکر فرمایا ہے، اور مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق کی بھی صراحت فرمائی ہے کہ اگر متوفی

کو میراث کے حق سے محروم رکھنا بھی ہے، شوہر کے انتقال کے بعد بیوی کو میراث دی جاتی ہے اور نہ اس بات کی فکر کی جاتی ہے کہ اگر بیوی کا حق مہر شوہر کے ذمہ واجب الادا ہو تو پہلے مہر ادا کیا جائے پھر ترکہ کی تقسیم عمل میں آئے، حالانکہ مہر بھی دوسرے دیون اور قرضوں کی طرح ایک قرض ہے، اور قرضوں کی ادائیگی کے بعد ہی بچی ہوئی جائداد سے وارثوں کا حق متعلق ہوتا ہے، قرآن نے احکامِ میراث میں بار بار اس کا ذکر کیا ہے، پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اس کو اس کے حقِ میراث سے بھی محروم کر دیا جائے، ایسی ہی زیادتی لڑکیوں کے حق میں بھی روا رکھی جاتی ہے، کہ پورے متروکہ پر لڑکے قبضہ کر لیتے ہیں، اور لڑکیوں کو ان کا حق ہی نہیں دیتے، بعض لڑکیاں تو نابالغ بھی ہوتی ہیں، ایسی صورت میں ان کو ترکہ سے محروم کر دینا دوہرے گناہ کا باعث ہے، ایک تو ناجائز طریقہ پر دوسرے کے مال پر قبضہ یعنی غصب، اور دوسرے یتیم کا مال کھانا، اور یتیم کے ساتھ ظلم جیسا شدید گناہ ہے وہ ظاہر ہے۔

لڑکیوں کو میراث سے محروم کرنے کا رواج اس قدر جڑ پکڑ گیا ہے کہ بعض خواتین اپنا حصۂ میراث طلب کرنے میں حیا اور حجاب محسوس کرتی ہیں، اور اگر کوئی لڑکی اپنا حق مانگے تو دوسرے اقرباء اور رشتہ دار بھی اسے عار دلاتے ہیں، اور اس کو ذلت اور خساست تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہ محض دین سے ناواقفیت اور ناسمجھی کی بات ہے، حصۂ میراث ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں دیتا، بلکہ یہ عطیۂ خداوندی اور قرآن کی زبان میں "فریضۃ من اللہ" ہے۔ اور اہل علم نے لکھا ہے کہ انسان کے لئے مال حاصل ہونے کے جتنے ذرائع ہیں، ان میں سب سے زیادہ حلال اور پاکیزہ ذریعہ بھی میراث ہے، اس لئے نہ میراث کے طلب کرنے میں تکلف کرنا چاہئے، نہ اس عمل کو باعثِ شرم خیال کرنا چاہئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ شریعت نے جس بات کو منع کیا ہے، اس کا ارتکاب کیا جاتا ہے، نکاح کو آسان رکھا گیا ہے اور نکاح میں لڑکی اور اس کے اولیاء پر کوئی مالی ذمہ داری نہیں رکھی گئی ہے، لیکن "گھوڑے جوڑے" اور "جہیز" کے مطالبے نے نکاح کی کمر توڑ رکھی

ہے، اور لڑکی ماں باپ کے لئے ایک بوجھ بن گئی ہے، اور جس چیز کا شریعت نے حکم دیا ہے یعنی حقِ میراث، اس سے ان کو محروم کیا جاتا ہے۔

بھی عورتوں کو حقِ میراث سے محروم کرنا اور بیٹیوں کو ترکہ میں سے حصہ نہ دینا سخت گناہ اور ظلم شدید ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی عدول حکمی بھی ہے، قرابت داروں کے ساتھ حق تلفی اور ناانصافی بھی، اور نہایت قبیح قسم کی حرام خوری بھی، حرام خوری ایسا گناہ ہے کہ یہ انسان کی عبادات کو ضائع کر دیتی ہے، اس کی وجہ سے دعائیں قبول نہیں ہوتیں، انسان طرح طرح کی آفتوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہوتا رہتا ہے اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے، اس لئے کسی بھی طرح یہ مناسب نہیں کہ انسان دنیا کی متاعِ حقیر کے لئے دنیا اور آخرت کا اتنا بڑا خسارہ مول لے، اور جانتے بوجھتے نقصان کی تجارت کرے!!

(۲۶ فروری ۱۹۹۹ء)

نام ـــــ قومی شناخت کا ایک اہم ذریعہ!

ہمارے ملک میں ایک تنظیم "راشٹریہ سیوک سنگھ" ہے، جس کا مخفف "آر، ایس، ایس" ہے، معنی کے اعتبار سے یہ لفظ بہت پُرکشش ہے، گویا یہ قومی خدمت گاروں کا ایک گروہ ہے، لیکن اس کے عزائم انتہائی خطرناک اور انسانیت دشمن ہیں، یعنی اس تنظیم کا بنیادی مقصد ملک کی اقلیتوں پر جبر و دباؤ قائم رکھنا، اور ان میں عدم تحفظ کے اسباب کو برقرار رکھنا ہے، گذشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے وہ اپنے ان مقاصد کے لئے سرگرم عمل ہیں، اور وطن کے نامۂ اعمال کے حرف حرف سے مظلوموں کے خون ولہو کی سرخی نمایاں ہے، کچھ عرصہ قبل جناب کے، سدرشن آر، ایس، ایس کے ذمہ دار منتخب ہوئے ہیں، وہ اس منصب پر فائز ہونے کے بعد ہی سے ایسے گرم بیانات دے رہے ہیں جو اقلیتوں کو مشتعل کرنے والے ہیں، اور اس طرح فرقہ پرست عناصر کو اپنے مذموم عزائم کے روبہ عمل لانے کا بہانہ ہاتھ آجائے، انہوں نے عیسائیوں اور سکھوں کے خلاف بھی ہرزہ سرائی کی ہے، لیکن مسلمان ان کا زیادہ نشانہ ہیں۔

ہفتہ عشرہ پہلے انہوں نے اپنے ایک بیان میں مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ وہ اپنے نام میں اسلام کے ساتھ ہندو ناموں کو بھی جوڑا کریں، جیسے "عبداللہ"، "محمد رام" وغیرہ نام رکھا کریں، انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ مسلمانوں نے اس ملک پر آٹھ سو سال حکومت کی، ان میں بہت سے مسلم حکمراں وہ تھے، جو اپنے سیاسی مسائل میں مسلمانوں کے مقابلہ ہندو بھائیوں کو قریب رکھتے تھے، اور جن مسلمان فرمانرواؤں کو آج یہ متعصب اور تنگ نظر کہتے ہیں، جیسے حضرت اورنگ زیب عالمگیر، وغیرہ، ان کا بھی حال یہ تھا کہ

بڑے بڑے سیاسی اور فوجی عہدوں پر انھوں نے ہندو بھائیوں کو رکھا تھا، اگر اتنا طویل عرصہ میں مسلمان دوسری قوموں کو بالجبر مسلمان بنانے کی کوشش کرتے، یا کم سے کم مسلمانوں کے سے نام رکھنے کی ان سے خواہش کی جاتی، اور انھیں مجبور نہیں کرتے صرف ان کو اس کی ترغیب ہی دیے ہوتے تو اس میں کیا شبہ ہے کہ اس ملک میں غالب ترین اکثریت مسلمانوں کی ہوتی، ایک ایسی قوم جسے درختوں اور پتھروں یہاں تک کہ کیڑے مکوڑوں کو بھی پوجنے میں عار نہیں، اور بے جان مظاہر قدرت کے سامنے سر ٹیکنے میں بھی کوئی تامل نہیں، اس کے لئے انسانوں کا مطیع و فرماں بردار ہو جانا اور فرماں رواؤں کے سامنے سر جھکانا کیا دشوار ہوتا؟ لیکن مسلمانوں نے کبھی ایسا نہیں کیا، اور اپنے پیغمبر کی تعلیم کے مطابق مذہب کے معاملہ میں جبر و دباؤ کی راہ اختیار کرنے سے ہمیشہ اجتناب برتا، اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو جناب سدرشن آج عبد اللہ یا عبد الرحمن ہوتے _ یہ ہے مسلمانوں کی رواداری! اور دوسری طرف ہمارے یہ کوتاہ ذہن، تنگ نظر اور شدت پسند قائدین ہیں کہ جو صرف نصف صدی میں دوسری قوموں کو اپنے وجود میں جذب کرنے کے درپے ہیں، وہ بدھسٹوں، سکھوں، اور جینیوں کو ہندو کہتے ہیں، عیسائی مبلغین کو نذر آتش کرتے ہیں، اور مسلمانوں کو بتاتے ہیں کہ ان کی رگوں میں رام اور کرشن کا خون ہے، اور تلقین کرتے ہیں کہ انھیں اپنے نام ہندوؤں کے سے رکھنے چاہئیں، کیا اس سے بھی بڑھ کر شدت پسندی، اور مذہبی دہشت گردی کی اور مثال ہو سکتی ہے؟؟

اللہ کا شکر ہے کہ ملک کے بدلتے ہوئے حالات نے مسلمانوں کے اندر ایک نیا شعور پیدا کیا ہے، اور وہ اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ ایسے بیانات کا مقصد ان کو مشتعل کرنا اور بھڑکانا ہے، اگر وہ مشتعل ہو جائیں تو یہ بالواسطہ ان فرقہ پرستوں کو تقویت پہنچانے کے مترادف ہوگا، چنانچہ مسلمانوں نے سدرشن صاحب کے ان بیانات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، اور سنی ان سنی کر دی، کسی بات کو اہمیت نہ دینا اور اس پر ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کرنا بھی معاندین کا ایک جواب ہے، اور بعض اوقات یہ جواب زیادہ موثر اور کم نقصان دہ ہوا کرتا ہے، اور حالات کا تقاضہ یہی ہے کہ مسلمان بہت سے مسائل میں

وہ طریقہ اختیار کریں جسے قرآن میں "معروف" کہا گیا ہے۔

تاہم مسلمانوں میں یہ شعور ہونا چاہئے کہ وہ کسی بات کے دائرہ اثر کو سمجھیں اور محسوس کریں کہ اس بات کو قبول کرنے یا رد کرنے میں ہمیں کیا نقصان اور فائدہ ہوسکتا ہے؟ تاکہ وہ جو بھی قدم اٹھائیں، وہ بصیرت سے بھرپور اور فراست ایمانی سے معمور ہو، ان کا بولنا بصیرت کے ساتھ بولنا ہو اور ان کا چپ رہنا بصیرت کے ساتھ چپ رہنا ہو۔ ــــــ

نام اور قومی انتساب کی بڑی اہمیت ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسی لئے مسلمانوں کو نام کے بارے میں بڑی واضح ہدایات دی ہیں، اور سماجی مسائل میں اس بابت حدیث میں جتنی وضاحت ملتی ہے، شاید ہی کسی اور امر کی بابت اس قدر تفصیل و وضاحت ہو، آپ ﷺ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ بہتر نام رکھے جائیں، حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تم لوگ قیامت کے دن اپنے اور اپنے باپ کے نام سے پکارے جاؤ گے، اس لئے اچھے نام رکھا کرو، (ابوداؤد: حدیث نمبر: ۴۹۴۸) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت میں مزید وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں، احب الاسماء الی اللہ تعالیٰ عبد اللہ و عبد الرحمن (ابوداؤد: ۴۹۴۹) یعنی ایسا نام جس سے اللہ تعالیٰ سے بندگی اور عبدیت کا رشتہ ظاہر ہو، کیونکہ یہ نام نہ صرف اس کی شخصیت بلکہ اس کے فکر و عقیدہ کا بھی ترجمان ہوتا ہے، اگر کسی شخص کا نام مشرکانہ ہوتا تو آپ ﷺ اس کا نام بدل کر ایسا نام رکھتے، جس سے بجائے شرک کے توحید کا اظہار ہوتا، ایک صاحب آئے، آپ ﷺ نے ان کا نام دریافت کیا، انہوں نے کہا: عبد العزیٰ، عزیٰ ایک بت کا نام تھا، زمانہ جاہلیت میں لوگ اس کی طرف نسبت کرتے ہوئے اپنا نام رکھتے تھے، آپ نے ان کا نام عبدالرحمان رکھا، (مجمع الزوائد: ۵۰/۸) مشرکین چونکہ جانوروں کی بھی پوجا کرتے رہے ہیں، اس لئے بعض لوگ اپنا نام جانوروں کی نسبت سے بھی رکھا کرتے تھے، چنانچہ عبدالرحمان بن سمرہ کا نام "عبد کلاب" تھا، کلاب "کلب" کی جمع ہے، اور "کلب" کے معنی کتے کے ہیں، آپ ﷺ نے ان کا نام بھی عبدالرحمان رکھا۔

(مجمع الزوائد: ۵۵/۸)

اور صرف مشرکانہ نام ہی پر منحصر نہیں، کوئی بھی ایسا نام جس سے غلط معنی پیدا ہوتا ہو، آپ ﷺ اسے پسند نہیں کرتے تھے، ایک خاتون کا نام "عاصیہ" تھا، جس کے معنی نافرمان کے ہیں، آپ ﷺ نے ان کا نام بدل کر "جمیلہ" رکھا، (ابوداؤد: ۴۹۵۲) حضرت علی ؓ نے حضرت حسنؓ حسینؓ کا نام حرب رکھنا چاہا، حرب کے معنی جنگ اور لڑائی کے ہیں، آپ ﷺ نے بجائے اس کے حسنؓ اور حسینؓ نام رکھے، (مجمع الزوائد: ۸؍۵۲) ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے ان کو "مسلم" سے موسوم فرمایا، (مجمع الزوائد: ۸؍۵۲) اسی طرح کی بہت سی مثالیں حدیثوں میں موجود ہیں، اسی طرح آپ ﷺ نے انبیاء کے نام پر نام رکھنے کی ترغیب دی، تسموا باسماء الانبیاء، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۹۵۰) اور خود اپنے صاحبزادے کا نام ابراہیم رکھا، کیونکہ نام سے انسان کے ذہن میں خود اپنی شناخت اور پہچان پیدا ہوتی ہے، جس شخص کا نام انبیاء، صحابہؓ اور اولیاء صالحینؒ کے نام پر ہو، اس کے ذہن میں ایک سوچ یہ ضرور پیدا ہوتی ہے کہ اس کا فکری نسب ان بزرگوں سے ملتا ہے، اور وہ اپنے عقیدہ و ایمان میں ان اہل اللہ کا وارث ہے۔

اسلام میں ایک خاص قانون "موالات" کا ہے، اس قانون کے تحت اگر کوئی عجمی شخص کسی عرب مسلمان قبیلہ کے ہاتھ پر ایمان لاتا تو وہ اسی قبیلہ کی طرف منسوب کیا جاتا، امام بخاریؒ یہاں النسل تھے، لیکن اسی نسبت سے جعفی یمانی کہلانے پر غور کیا جائے تو فقہاء کے استنباط کئے ہوئے اس قانون میں بہت ہی عمیق اور دور رس فکر کارفرما ہے، اور وہ فکر یہ ہے کہ انسان جبلی طور پر اپنے آباء و اجداد سے محبت رکھتا ہے، اور ان کی نسبت کو باعث افتخار جانتا ہے، اس لئے اگر مسلمان ہونے کے بعد بھی زمانۂ کفر کی خاندانی نسبت اس کے ساتھ لگی رہے تو اس سماج سے وہ پوری طرح اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکے گا، اور اگر کر بھی لے تو یہ اندیشہ باقی رہے گا کہ کل ہو کر جب حالات بدل جائیں تو اس کی اگلی پشتیں پھر اپنے ماضی سے فکری رشتہ استوار کرنے کی کوشش کریں، لیکن جب وہ ایک مسلمان خاندان سے منسوب ہو جائے گا تو اس کا سرمایۂ افتخار ایک ایسی خاندانی نسبت ہوگی، جو شروع سے مسلمان ہے، اور اس کا اندیشہ باقی نہیں رہے گا کہ وہ اپنے ماضی کی طرف لوٹ جائے۔

چنانچہ ایران، عراق، مصر و شام وغیرہ کا بہت بڑا علاقہ جو اسلام کے زیرِ نگیں آیا، وہ اس طرح اسلام سے وابستہ ہو گیا کہ ان کی تہذیب و ثقافت پر کفر کی کوئی چھاپ باقی نہ رہ گئی، یہاں تک کہ ان کی زبان تک بدل گئی، برصغیر کے بہت سے علاقوں میں راجپوتوں نے اسلام قبول کیا، چونکہ یہ ایک بہادر قوم ہے، اور مسلمانوں میں پٹھان اپنی بہادری میں مشہور تھے، اس لئے انہوں نے مسلمان ہونے کے بعد پٹھان کہلانا پسند کیا، اور آج ہندو پاک میں پٹھان خاندان کی بعض شاخیں موجود ہیں، جو اصل میں راجپوت تھے، لیکن اب ان میں اپنے راجپوت ہونے کا ذرہ برابر بھی احساس باقی نہ رہا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایک طویل عرصہ تک ان سے اسلام کی اور مسلمانوں کی حفاظت کی خدمت لی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب عربوں کے سامنے اسلام پیش کیا تو یہ وہ دین حق تھا، جو حضرت آدم علیہ السلام سے آپ تک ہر دور میں آتا رہا، لیکن آپ ﷺ نے اس دین کے دینِ ابراہیمی اور اس ملت کے متبع ابراہیمی ہونے کی حیثیت کو زیادہ ابھارا، اور اس پہلو کو اپنی تعلیمات میں ابراہیم اور اسلام کے نمائندہ تہواروں میں نمایاں فرمایا، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف مشرکینِ عرب بھی آسمانی کتاب سے محروم ہونے کے باوجود اپنی نسبت کیا کرتے تھے، اور یہود و نصاریٰ بھی اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وارث سمجھتے تھے، گویا جو تین قومیں آپ ﷺ کی دعوت کی اولین مخاطب تھیں، وہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت کو اپنے لئے باعثِ صد اعزاز سمجھتی تھیں، اور آپ ﷺ کی تعلیمات تو اصل میں اسوۂ ابراہیمی ہی پر مبنی تھیں، اس لئے اس نسبت کی وجہ سے ان کو اسلام قبول کرنے میں کوئی عار نہیں تھی۔

ہندوستان کے بعض علاقوں خاص کر راجستھان اور گجرات کے کچھ حصوں میں بہت سے ہندو خاندان صوفیاء کی کوششوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے، لیکن انہوں نے اپنے نام کے ساتھ اپنی سابقہ خاندانی نسبتوں کو بھی قائم رکھا، وہ ٹھاکر، چودھری، [illegible] وغیرہ کہلائے، نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کی اگلی نسلیں دین سے دور اور علم دین سے محروم ہوئیں، اور لوگوں نے تحریص اور ترہیب کے ہتھیار استعمال کئے اور ان کو ان کی آبائی نسبت یاد دلائی تو بعض علاقوں میں ارتداد کا فتنہ پھوٹ پڑا اور ان نسبتوں نے اس مذموم مہم

کو تقویت پہنچائی، انڈونیشیا اور اس علاقے کے بعض ممالک میں ایسے نام رکھے جاتے ہیں جن میں ہندوانہ اور عیسائی ناموں کی آمیزش ہوتی ہے، جس کا اثر وہاں ارتداد کی شکل میں ظاہر ہوا، ہندوستان میں بودھسٹ، جین اور بہت سے سکھ بھی ہندو ثقافت میں جذب ہوتے جارہے ہیں، کیونکہ ان کے نام ہمارے اہل وطن کے سے ہیں، اس لئے خود ان کے ذہن میں ان کی ثقافت باقی نہیں رہی، اس لئے نام کے مسئلہ کو کم اہم نہ سمجھنا چاہئے، اس سے اعتقادی، فکری، تہذیبی، ثقافتی اور لسانی شناخت متعلق ہے، جو قوم اپنے نام کی بھی حفاظت نہ کرسکے، اس کے لئے اپنی فکر اور اپنی تہذیب کی حفاظت تو اور بھی دشوار ہے، اور جس قوم کی اپنی کوئی فکر اور تہذیب نہیں ہوتی، اس کو دوسری قوم کے ساتھ جذب ہونے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی، اس لئے ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ محض نام رکھنے کی دعوت نہیں ہے، بلکہ اپنے دور رس اثرات کے اعتبار سے فکری و تہذیبی ارتداد اور اپنے وجود کو گم کردینے کی دعوت ہے!

(۱۰/مارچ ۲۰۰۱ء)